ماہنامہ
مجلہ

حیاتِ نو

بلریا گنج

"یہ ماہ ربیع الاول اگر تمہارے لیے خوشیوں کی بہار ہے تو صرف اس لیے کہ اسی مہینے میں دنیا کی خزاں وضلالت ختم ہوئی اور کلمہ حق کا موسم ربیع شروع ہوا۔ پھر اگر آج دنیا کی عدالت سموم ضلالت کے جھونکوں سے مرجھا گئی ہے، تو غفلت پرستو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ بہار کی خوشیوں کی رسم تو مناتے ہو مگر خزاں کی پامالیوں پر نہیں روتے"

(مولانا ابوالکلام آزادؒ)

ایک اہم اپیل

جامعۃ الفلاح جیسے وسیع المقاصد اور کثیر الاقسام ادارے کیلئے ایک نہیں کئی چھوٹی گاڑیوں کی ضرورت اظہر من الشمس ہے لیکن بدقسمتی سے اب تک یہاں کوئی ایک چھوٹی گاڑی بھی نہیں آسکی جسکا احساس خود جامعہ کو اور اس کے ہمدردوں کو شدت سے رہا ہے اور یہ احساس، کسی مہمان کی آمد، کسی طالبعلم یا طلبہ کی اچانک بیماری نیز اطراف و جوانب سے دعوتی و تحریکی ربط کے موقع پر شدید تر ہو جاتا ہے۔

چنانچہ انجمن نے ایک جیپ کی فراہمی کا فیصلہ کیا کہ انجمن کے کام آئے اور اسکے ذریعہ مذکورہ مقاصد حاصل کئے جائیں۔ پہلے ارادہ ایک سکنڈ ہینڈ جیپ کی خریداری کا تھا لیکن انجمن کے مخلصین اور ہمدردان نے نئی خریدنے کا مشورہ دیا اور اس خیال کی حوصلہ افزائی کی بعض فلاحی برادران نے اس مہم میں دل کھول کر حصہ لیا اور دوسرے بعض رفقاء نے وقت آنے پر اپنے خصوصی تعاون کا وعدہ کیا۔

خدا کا شکر ہے کہ جیپ کے مجوزہ بجٹ کا ½ حاصل کیا جا چکا ہے۔ بقیہ کیلئے کوشش جاری ہے۔ انجمن کے تمام ہمدردان سے اور خصوصاً تمام فلاحی برادران سے پرزور اپیل ہے کہ اس فنڈ کی فراہمی میں ہر ہر فرد ضرور حصہ لے چاہے اس کا حصہ بظاہر معمولی ہی کیوں نہ محسوس ہوتا ہو اس مہم میں اسکی شرکت ضرور ہو کہ قطرہ قطرہ سے ہی تالاب بھرتا ہے۔

جیپ کا ایک مہذب ماڈل پسند کر لیا گیا ہے، بس فنڈ کی تکمیل کا انتظار ہے اسلئے آپ آپ اپنا اور اپنے قریبی رفقاء اور ہمدردوں کا تعاون مندرجہ ذیل پتہ پر بھجوائیں۔

ڈرافٹ پر "انجمن طلبہ قدیم" [illegible] A/C No. 6854 بلریاگنج برانچ" لکھنا کافی ہوگا خط میں یہ صراحت ضرور کریں کہ یہ رقم جیپ فنڈ کی ہے۔

پتہ:- صدر انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۱۲۱

والسلام
آپ کا
(صدر انجمن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ
حیات نو بلریاگنج

جلد: ۹، صفر، ربیع الاول ۱۴۱۴ھ اگست، ستمبر ۱۹۹۳ء شمارہ: ۸، ۹

بدل اشتراک

سالانہ زر تعاون	۵۰/ روپے
طلبہ کیلئے	۳۰/ ″
خصوصی زر تعاون	۱۰۰/ ″
اعزازی ″	۱۰۰۰/ ″
غیر ممالک سے زر تعاون	۲۵/ امریکی ڈالر
قیمت فی شمارہ	۵/ روپے
اس شمارہ کی قیمت	۷/ روپے

مدیر مسئول
نور محمد فلاحی

مدیر
محمد اسمعیل فلاحی

معاون مدیر
عبد البر اثری فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ مجلہ "حیات نو" جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۱
فون ۔ ۴۱۸۱۶۰

فلاح آفسٹ پریس ذاکر نگر اعظم آباد۔
کتابت: محمد اشفاق عالم مفتاحی
جامعۃ الفلاح بلریاگنج

نقوش حیات نو

صفحہ

اداریہ

علم دین اور اخلاص — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۳

بحث و نظر

حذف — خالد مسعود — ۶

خلافت ارضی اور علمائے اسلام — محمد حسن حبیب فلاحی — ۱۱

اقبال اور زندگی کا اعلیٰ نصب العین — ڈاکٹر محمد فاروق اعظم — ۲۷

تاریخ کا سب سے بڑا مظلوم — سید انور کمال — ۲۰

تعلیم و تعلم

مطلع اتنا ابر آلود بھی نہیں ہے — سید حامد — ۲۴

سیر و سوانح

مولانا مسعود عالم ندویؒ ایک بلند پایہ عربی ادیب — عبد الحمید فاضلی ندوی — ۳۳

اسلام کے دشمن جو اس کے دوست ہو گئے — ۵۷

تعارف و تبصرہ ۔ آموزگار — عبد الرازق فلاحی — ۶۳

شعر و نغمہ ۔ حمد، نعت — ادریس ضیا، ریاض احمد قاصد — ۵

نذر فکریہ، غزلیں — قمر لشکری، ایم ۔ شمسی، ابو عمیر عقل — ۴۸، ۱۰، ۲۳

اخبار علمیہ

قرآن و حدیث کا پہلا اردو کمپیوٹر پروگرام ..... — ابن العلم فلاحی — ۶۰

جامعہ کے لیل و نہار

مولانا محمد شفیع مونس صاحب جامعہ ہیں ..... — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۶۳

روداد انجمن

تعارف انجمن، ماہانہ نشست — " " " — ۶۶، مائیل

اداریہ — محمد اسمٰعیل فلاحی

علم دین اور اخلاص

ملک کے طول و عرض میں دینی مدارس کا ایک جال سا بچھتا جا رہا ہے اور ان سے سند فراغت حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود یہ شکایت عام ہے کہ رجالِ علم و فن اب نہیں پیدا ہو رہے ہیں اور علمی معیار مسلسل گر رہا ہے۔

اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن ایک چیز سب سے بڑھ کر اور بطور خاص قابل غور ہے۔ اور وہ ہے اخلاص اور حسن نیت، ہمیں اپنی نیتوں کا جائزہ لینا اور اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھنا چاہئے کہ ہمارے اندر دین کا علم حاصل کر کے اس پر عمل کرنے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کا کتنا جذبہ ہے، کہیں دوسرے جذبات اور محرکات تو شامل نہیں ہو گئے ہیں۔ کسی بھی کام میں حسن نیت اور اخلاص کی بڑی اہمیت ہے لیکن دین اور علم دین کا معاملہ بڑی نزاکتیں رکھتا ہے، یہاں نیتیں بالکل خالص ہونی چاہئیں، ذرہ برابر آمیزش زہر ہے جس کا نہ صرف یہ کہ کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ اس کا انجام انتہائی بھیانک ہو سکتا ہے۔ دنیا پرست عالم کے بارے میں حدیث میں آیا ہے۔

ورجلٌ آتاہ اللہ علماً فبخل بہ عن عباد اللہ واخذ علیہ طمعاً وشری بہ ثمناً فذلک یلجم یوم القیامۃ بلجام من نار۔ (زاد راہ ص۴۱)

وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے دین کا علم بخشا اور اس نے اللہ کے بندوں کو دین کا علم سکھانے میں بخل سے کام لیا اور مسکین یا تو اس پر مال وصول کیا اور اپنی دنیا بنائی۔ ایسے شخص کو قیامت کے دن آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔۔۔۔

ایک بار نبیؐ نے ایک فتنہ کا ذکر فرمایا جس کی سنگینی کا عالم یہ ہوگا کہ چھوٹے بڑے سب

اور بوڑھے اپنے بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ جائیں گے اور وہ فتنہ سنت سمجھا جانے لگے گا۔ اگر کوئی اس میں تبدیلی کے لیے اٹھے گا تو اسے ناپسندیدہ قرار دیا جائے گا اور اس پر نکیر کی جائے گی۔ آپؐ نے فرمایا ایسا اس وقت ہوگا جب ......

إِذَا قَلَّتْ أُمَنَاؤُكُمْ وَكَثُرَتْ أُمَرَاؤُكُمْ وَقَلَّتْ فُقَهَاؤُكُمْ وَكَثُرَتْ قُرَّاؤُكُمْ وَتُفُقِّهَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ وَالْتُمِسَتِ الدُّنْيَا بِعَمَلِ الْآخِرَةِ۔ (دارمی)

جب تمہارے امانتدار اور قابل اعتماد لوگ کم ہو جائیں گے اور اقتدار کی ہوس رکھنے والے زیادہ، دین کے فقیہ اور واقعی علماء کم ہو جائیں گے اور دین کے پڑھنے والے زیادہ۔ دین کو دنیا حاصل کرنے کیلئے پڑھا جائیگا اور نیک کام سے مقصود دنیا کا حصول ہوگا۔

جب دین کو دنیا کے حصول کیلئے پڑھا جاتا ہے تو پھر یہ علم سینہ میں نہیں اترتا اور اسکے مطلوبہ ثمرات ظاہر ہونے کی بجائے کڑوے کسیلے پھل ہی سامنے آتے ہیں۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ، فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذٰلِكَ الْعِلْمُ النَّافِعُ وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذٰلِكَ حُجَّةُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ابْنِ آدَمَ۔

علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم وہ ہے جو سینہ میں اتر جاتا ہے یہی علم نافع ہے، دوسرا وہ علم ہے جو صرف زبان پر رہتا ہے، یہ علم ابن آدم کے خلاف اللہ عزوجل کی حجت ہوگا۔

جب نیتیں بدلتی ہیں اور دنیا مقصود بنتی ہے تو پھر انسان نہ تو اس کے آداب ملحوظ رکھتا ہے اور نہ اسکے حدود کی پاسداری کرتا ہے۔ معاصی سے کنارہ کشی، لغویات سے پرہیز، وقت کا صحیح استعمال، اساتذہ کی ہدایات پر عمل، سکینت و وقار کا التزام اور اساتذہ کا احترام حصول علم کے انتہائی ضروری آداب ہیں۔ نبیؐ نے فرمایا ہے۔

تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَتَعَلَّمُوا لِلْعِلْمِ السَّكِيْنَةَ وَالْوَقَارَ وَتَوَاضَعُوْا لِمَنْ تَعَلَّمُوْنَ مِنْهُ۔

علم دین حاصل کرو، علم دین کیلئے سکینت و وقار سیکھو اور اپنے اساتذہ سے خاکسارانہ برتاؤ کرو

مدارس کے سابقہ کردار کو بحال کرنے پر غور کرنے کیلئے جب کبھی ہم بیٹھیں تو ہمیں شدت کے ساتھ اس پہلو کا ضرور جائزہ لینا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ کہیں ان مدارس کو کسی اور رخ پر تو نہیں بہایا جا رہا ہے۔ یا دوسرے مقاصد کے حصول کیلئے بطور زینہ تو استعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ ارباب مدارس، طلبہ اور ان کے سرپرستوں سب کے لئے یہ چیز فوری قابل غور ہے۔

حمد

—— ادریس ضیاء ——

بس وہی گراتا ہے روز دن کے پردوں کو
ماہتاب دیتا ہے جو سیاہ راتوں کو
اتنی وسعتیں تیری شش جہت میں پھیلی ہیں
کیا دکھائی دے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو
کیں حفاظتیں کس نے غار میں محمدؐ کی
بے نشاں کیا کس نے ابرہہ کی فوجوں کو
کس کی ہے یہ فنکاری خوشنما گلابوں میں
کون جنم دیتا ہے تتلیوں کے رنگوں کو
جھوم کر شجر سارے تیری نظم گاتے ہیں
گیت تیری عظمت کے یاد ہیں پرندوں کو
ڈھک دے اپنی رحمت میں بے لباسیاں میری
تو لباس دیتا ہے پتیوں کا شاخوں کو

نعت

—— ریاض احمد قاصد —— متعلم جامعۃ الفلاح

کتنی پر کار ہے زندگی آپ کی
صاف ہے چاند سے روشنی آپ کی
دیکھ کر آپ کے حسن کردار کو
سب نے تسلیم کی پیروی آپ کی
یوں تو دشمن تھا سارا زمانہ مگر
تھی کسی سے نہیں دشمنی آپ کی
سارے عالم پہ چھائی تھیں تاریکیاں
مٹ گئی ذات سے تیرگی آپ کی
راہزن جتنے تھے پاسباں ہو گئے
قابل رشک تھی رہبری آپ کی
اس کو حاصل ہوئی نعمت دو جہاں
پیروی جس نے بھی دل سے کی آپ کی

حذف

حذف فاعل و مفعول:

قرآن مجید کی متعدد آیات میں فعل کے فاعل یا مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کے مختلف اسباب اور مختلف فائدے ہوتے ہیں لیکن یہ حذف وہیں ہوتا ہے جہاں اس بات کا واضح امکان موجود ہوتا ہے کہ قاری فاعل یا مفعول کو خود متعین کرے گا۔ اب ہم اس طرح کے حذف کی بعض مثالیں پیش کریں گے۔

۱۔ بعض اوقات سلسلہ کلام میں ایک چیز کا ذکر ہو کر قاری کے ذہن میں مرتسم ہو چکا ہوتا ہے۔ اب اگر اس کا تذکرہ لفظوں میں نہ بھی کیا جائے تو قاری کا ذہن از خود اس کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کو لفظوں میں لا کر قرآن کلام کو ثقیل نہیں بناتا بلکہ قاری کی ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ سلسلہ کلام میں اس چیز کا ذکر قریب بھی ہو سکتا ہے اور دور بھی۔ ان میں سے ہر ایک کی مثال حسب ذیل ہے۔

۱۔ فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنذَرِينَ (صافات ۱۷۷)

"وہ جب ان کے صحنوں میں اترے گا تو بڑی ہی بری ہوگی صبح ان لوگوں کی جن کو اس سے آگاہ کیا جا چکا ہے۔"

آیت میں فعل نزل کا فاعل محذوف ہے لیکن اس کو آیت ماسبق کی روشنی میں متعین کیا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد عذاب ہے جس کے لئے کفار جلدی مچا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب ہم رسول کی تکذیب کر رہے ہیں تو حسب وعدہ عذاب کیوں نہیں آ رہا ہے۔ آیت میں ان کو خبردار کیا ہے کہ جب یہ عذاب آ دھمکے گا تو یہ کوئی معمولی آفت نہیں ہوگی۔

ب۔ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ۝ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ (قلم ۱۹-۲۰)

"ابھی وہ سوئے پڑے ہی تھے کہ اس پر تیرے رب کی طرف سے گردش کا ایک جھونکا آیا تو وہ [illegible] فصل کے مانند ہو گیا۔"

یہاں فعل اصبحت کا فاعل الفاظ میں بیان نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کئی آیت اوپر سلسلہ کلام میں ذکر اصحاب الجنۃ یعنی ایک باغ والوں کا ہے جو نہایت بے خوف اور مطمئن تھے کہ ان کا باغ موسمی تغیرات سے گزر کر اب تمام آفتوں سے محفوظ ہو چکا ہے اور اگلی صبح اس کا پھل توڑنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ان کی سرکشی کا مزا چکھانا چاہتا تھا اس لئے راتوں رات باغ پر آندھی بھیج کر اس باغ کو کٹی ہوئی فصل کے مانند کر دیا۔ سلسلہ کلام کی روشنی میں اصبحت کا فاعل الجنۃ یعنی باغ ہے۔ واقعہ پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں اس فاعل کے بارے میں کوئی ابہام نہیں رہ جاتا۔

۲۔ کبھی سلسلہ کلام میں کوئی قرینہ ایسا موجود ہوتا ہے جس کی روشنی میں کسی فعل کا فاعل بآسانی متعین کرنا ممکن ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا

إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّافِنَاتُ الْجِيَادُ ۝ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَن ذِكْرِ رَبِّي حَتَّىٰ تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (ص ۳۱-۳۲)

"ایک دن شام کو اس کے ملاحظے کے لئے اصیل اور عمدہ گھوڑے پیش کئے گئے تو اس نے کہا کہ یہ تو مال کی محبت میں لگ کر میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ (سورج) پردے میں چھپ گیا۔"

اس آیت میں فعل توارت کا فاعل محذوف ہوا ہے۔ اس کے تعین کا قرینہ اوپر کا لفظ عشی فراہم کرتا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق عصر اور مغرب کے درمیان کے وقت پر ہوتا ہے۔ جس واقعہ کا حوالہ آیت میں ہے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ گھوڑوں کے معائنہ میں وہ کچھ ایسے منہمک ہوئے کہ عصر کی نماز کا وقت نکل گیا اور سورج غروب ہو گیا۔ قرینہ کی موجودگی میں لفظ سورج کے اظہار کی ضرورت نہ تھی۔

۳۔ کبھی قرینہ الفاظ میں موجود نہیں ہوتا لیکن مضمون میں پایا جاتا ہے۔ سورہ یوسف کی آخری آیت ہے۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ

يُؤْمِنُوْنَ (سورۂ یوسف ۱۱۱)

"یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے۔"

یہاں ذکر قرآن مجید کا ہو رہا ہے لیکن الفاظ میں اس کو بیان نہیں کیا۔ اس کا قرینہ اوپر کی آیات میں بھی الفاظ میں موجود نہیں ہے لیکن زیر بحث جو بات ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وحی کی باتوں پر اعتماد نہیں کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا وحی الٰہی سے رہنمائی حاصل کرنے کا دعویٰ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ چنانچہ آپ عذاب الٰہی سے جو ڈرا رہے ہیں تو یہ محض ایک من گھڑت دھمکی ہے۔ اس مضمون کی روشنی میں "ما کان" کا فاعل "قرآن" بآسانی متعین ہو جاتا ہے۔

۴۔ کلام میں اس کی غایت درجہ وضاحت کے باعث بھی کسی لفظ کا بیان غیر ضروری ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر حذف کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ا۔ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ (القیمۃ ۲۶-۳۰)

"ہرگز نہیں، جب کہ (جان) ہنسلی میں آ پھنسے گی اور کہا جائے گا اب کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا، اور وہ گمان کرے گا کہ بس وقت چل چلاؤ کا ہے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی، اس دن تیرے رب کی طرف جانا ہوگا۔"

ان آیات میں عیش دنیا کے متوالوں کو موت کی جان کنی اور اس وقت کی مایوسی و بے بسی کی یاد دہانی ہے۔ جان کنی کی تصویر اتنی واضح ہے کہ لفظ نفس (جان) کے استعمال کے بغیر بھی مفہوم ادا ہو رہا ہے۔ اس کے فعل "بلغت" کا فاعل نفس محذوف ہے۔

ب۔ ٹھیک یہی مضمون سورۃ الواقعہ کی آیت ۸۳ فلولا اذا بلغت الحلقوم (تو کیوں نہیں اس وقت جب کہ (جان) حلق میں پہنچتی ہے) میں بیان ہوا ہے۔ وہاں بھی بلغت کے فاعل نفس کو حذف کر دیا ہے۔

ج۔ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ

امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ (القصص ۲۳)

"اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے اس پر لوگوں کی بھیڑ دیکھی جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اور ان سے ورے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے گلے کو روکے کھڑی تھیں۔"

یہاں فعل یسقون اور تذودان کا مفعول حذف ہے۔ جملے کی غایت وضاحت اور قرائن کی بدولت اس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

د۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (الصّٰفّٰت ۷۸، ۱۰۸، ۱۲۹)

"ہم نے اس کے طریقہ پر پچھلوں میں سے (ایک گروہ) چھوڑا" یہاں بھی غایت وضاحت کے باعث فعل "ترکنا" کا مفعول حذف ہو گیا ہے۔

۵۔ کبھی کوئی لفظ ایک ہی جملہ یا دو متصل جملوں میں دوبارہ آ جاتا ہے۔ اگر اس کا اظہار دونوں جگہ کر دیا جائے تو کلام میں تکرار کا عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ کلام کو اس ثقافت سے بچانے کے لئے اس لفظ کو صرف اس جگہ ظاہر کیا جاتا ہے جہاں اس کا اظہار ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے مقام میں اس کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ا۔ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (البقرۃ ۱۹۷) "اور تقویٰ کا زاد راہ لو، بہترین زاد راہ تقویٰ ہے۔" یہاں تزودوا کا مفعول التقویٰ ہے جو کلام میں حذف ہے۔ اگر اس کا اظہار کیا جاتا تو کلام ثقیل ہو جاتا۔ دوسری جگہ اس کے اظہار کے بغیر چارہ نہ تھا لہٰذا وہاں لفظ کو ظاہر کر دیا اور پہلے موقع پر حذف کر دیا۔ اس حذف کی طرف رہنمائی فان کے حرف سے ہو رہی ہے جو یہاں علت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ب۔ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (السجدۃ ۱۴)

"تو اب چکھو (عذاب) اس جرم میں کہ تم نے اس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا۔ ہم نے بھی تم کو نظر انداز کیا اور تم اپنے کئے کی پاداش میں اب ہمیشگی کا عذاب چکھو۔"

یہاں بھی تکرار سے بچنے کے لئے پہلے ذوقوا کا مفعول حذف کیا گیا ہے۔ ذوقوا کی

تکرار سے عبرت کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

۶۔ بسا اوقات ایک فعل کا مفعول پہلو دار ہوتا ہے۔ وہاں اگر کوئی لفظاً مفعول متعین کر دیا جائے تو اس کا صرف ایک پہلو بیان ہو سکے گا اور عبارت کا مفہوم محدود ہو جائے گا حالانکہ دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مفعول کو حذف کر دینے سے قاری کے فکر کے لئے ایک جولان گاہ فراہم کر دی جاتی ہے کہ وہ موقع کلام کے مطابق خود کئی مفعول سوچ لے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (الحجرات:۱)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کے سامنے مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو"

کس چیز کو مقدم نہ کرو یہ بات الفاظ میں ادا نہیں ہوئی۔ معلوم ہے کہ مقدم کرنا کئی پہلوؤں سے ہو سکتا ہے مثلاً اپنی شخصیت کو زیادہ اہمیت دینا، اپنے مفاد کو زیادہ عزیز رکھنا، اپنی رائے کو رسول اللہ کی رائے سے فائق سمجھنا وغیرہ۔ ان تمام پہلوؤں تک رہنمائی کی گنجائش باقی رکھنے کے لئے لاتقدموا کا مفعول حذف کر دیا گیا۔

غزل

ایم۔ اے۔ شمسی دودھگھری
استاد مدرسہ بیت العلوم دیگھیار [illegible]

سازش یہ بے نقاب ہوئی آسمان کی — چھت گر گئی آخرش بچے مکان کی
دل سے جو بات بول گئی پوری ہو گئی — تاثیر دیکھی میں نے ماں کی زبان کی
اب سر پھری ہواؤں سے ڈرنا ہے عجیب — ہمت تو میں نے کر لیا اونچی اڑان کی
واپس ہوا سفر سے تو ماں نے بلائیں لیں — محسوس پھر نہ کچھ ہوئی شدت تکان کی
اللہ جانے ٹوٹ کے کب سر پہ آ گرے — کب تک منائیں خیر ہم اس سائبان کی
اس ماں کے حال زار کو شمسی تو پوچھئے — میت ہو جس کے سامنے بیٹا جوان کی

محمد حسن حبیب فلاحی

خلافت ارضی اور علمائے اسلام

انسان اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کا نائب اور خلیفہ ہے۔ اس نے انسانوں کو اختیارات اور آزادی دے کر فرشتوں اور جملہ مخلوقات سے ممتاز بنایا اور خلافت کا تاج عطا کیا۔ جس کے نتیجہ میں انسانوں کا مقام سب سے بلند قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ہی انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم منتخب فرمائے اور کار خلافت کی انجام دہی کے لئے ان کو مامور کیا۔ انبیائے کرام کی خلافت براہ راست تھی جس کا سلسلہ آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا۔ آپؐ کے بعد یہ خلافت پوری امت محمدیہ کے ذمہ آئی۔ اب یہ کام پوری امت کا ہے اور چونکہ انبیائے کرام کے سلسلہ پر مہر الٰہی ثبت ہو چکی ہے اس لئے قیامت تک اس امت کو یہ ذمہ داری انجام دینی ہے۔ اس طرح خلافتِ ارضی امت مسلمہ کا مشترکہ فریضہ قرار پائی۔

اس امت کے علمائے کرام جو علم کے وارث ہونے کے نتیجہ میں انبیائے کرام کے سچے جانشین ہوتے ہیں۔ اپنے علم اور مقام کے اعتبار سے اس ذمہ داری کے سب سے زیادہ اہل بھی ہیں اور اس کے لئے سب سے زیادہ مسئول بھی۔ پیغمبر آخر الزماں نے فرمایا

كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِیَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِیٌّ خَلَفَهٗ نَبِیٌّ وَاِنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ وَسَیَكُوْنُ خُلَفَاءُ فَیَكْثُرُوْنَ (متفق علیہ)

انبیائے بنی اسرائیل انکی رہبری کرتے تھے جب بھی انکے ایک نبی کا وصال ہوتا دوسرا انکی جانشینی کرتا۔ میرے بعد چونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ بلکہ میرے خلفاء ہوں گے اور انکی تعداد کافی ہوگی۔

خلافت ۔ معنی و مفہوم | لغت میں اسکے معنی نیابت اور جانشینی کے ہیں خلیفہ بعد میں آنے وا

کو کہتے ہیں۔ مشہور مفسر قرآن مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ "معارف القرآن" میں رقم طراز ہیں "پہلا مسئلہ خلافت کا ہے، زمین کا انتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے اسکی طرف سے کسی نائب کا مقرر ہونا ۔ ۔ ۔ اس سے دستور مملکت کا اہم باب نکل آیا کہ اقتدار اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے" (معارف القرآن ۔ ج ۱ ص ۱۲۴)

"قائد تحریک اسلامی مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "قرآن دراصل خلافت اور استخلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے ۔ ۔ ۔ اس کے ایک معنی ہیں خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا" اس معنی میں پوری اولاد آدم زمین میں خلیفہ ہے۔ دوسرے معنی ہیں خدا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اختیارات خلافت کو استعمال کرنا، اس معنی میں صرف مومن صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے تیسرے معنی ہیں اُس دور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا۔ (تفہیم القرآن سورہ نور حاشیہ نمبر ۸۳)۔

تدبر قرآن اور تزکیہ نفس کے مصنف مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں۔

"خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کیلئے اس کی جگہ لے۔" (تدبر قرآن ج ۱ ص ۱۵۰)

قرآن حکیم میں اس کا استعمال مختلف مقامات پر ہوا ہے، ان کو سامنے رکھتے ہوئے غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے شر و فساد کو ختم کرکے اس میں امن و آشتی قائم کرنے اور باطل نظام ہائے زندگی پر حق کو غالب کرنے کے لئے انسانوں کی تخلیق فرمائی اور اسی مقصد تخلیق کے پیش نظر انسانوں کو دنیا میں اختیارات دیئے گئے۔ گویا اس کی اصل یہ قرار پائی کہ اصل حکمراں نے اپنی طرف سے ایک اہم فریضہ کی انجام دہی کیلئے اپنے بندوں کو منتخب کیا جس کا مقصد اس نائب کو کچھ اختیارات دے کر ان کی اطاعت و وفاداری کا امتحان تھا۔

امت کی قیادت کا مسئلہ

امت کی قیادت میں علمائے کرام کا کیا رول ہے یا صالح قیادت علماء کے ذریعہ کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ماضی قریب کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔ تاریخ اس حقیقت پر شاہد عدل ہے کہ امت کے صالح علمائے کرام نے ہمیشہ اس کی قیادت اور رہنمائی کی اور قیادت کے بحران سے ملت کو کبھی دو چار ہونے نہ دیا۔ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد بھی علمائے حق نے ملت کو سہارا دیا اور شدید سے شدید دور انتشار میں بھی رہبری اور دستگیری کی۔ لیکن وائے ناوانی! کہ بعد میں ساری صلاحیتوں کے باوجود ارباب سیاست ناقصہ سے تقرب کی کوشش، دنیا طلبی، تن آسانی اور امت کی قیادت سے پہلوتہی نے پوری ملت کو صالح قیادت اور مخلص رہبری سے محروم کر دیا۔ احساس محرومی کے ساتھ یہ داعی گروہ بالآخر زوال کی ڈگر پر چل پڑا اور دیکھتے دیکھتے انتشار، ذلت اور محکومی اس کی پہچان بن گئی ۔ حالانکہ ہمارا ماضی حال سے زیادہ تابناک تھا۔ برطانوی سامراج کے خلاف اعلان جہاد، نظام ظلم و جبر سے بغاوت، ۱۸۵۷ء میں حق پسند علمائے کرام کی جانی قربانیاں، تحریک ریشمی رومال میں مولانا محمد میاں کی جانی قربانیاں، ظلم کے خلاف سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مسلح جدوجہد اور جام شہادت نوش کرنے کے ولولہ انگیز واقعات، عثمانی خلافت کی بقا و تحفظ کے لئے ۱۹۲۴ء تک کی مسلسل جدوجہد ۔ ۔ ۔ آخر ان تمام کارہائے نمایاں کا سہرا کس کے سر ہے۔ کبھی ہم نے سنجیدگی سے اپنی تاریخ دہرانے کی کوشش کی؟

یہ بات خوش آئند ہے کہ امت مسلمہ لمبے سکوت کے بعد ایک بار پھر کروٹ لے رہی ہے، برسوں کے تعطل کو توڑ کر متحرک ہونے کے لئے فکر مند و کوشاں نظر آرہی ہے۔ نیا جذبہ، جواں عزم اور بلند حوصلہ اس کے چہرے سے عیاں ہے — مشرق سے مغرب تک ہر سطح پر بیداری کی ایک لہر دکھائی دے رہی ہے۔ اور وقت کا مورخ ہماری پیش قدمی کا منتظر ہے — ایسے اہم موڑ پر علماء کا رول کتنا اہم

ہو سکتا ہے اس کا اندازہ ہر ذی عقل آسانی لگا سکتا ہے اس کے برعکس اس موقع کی معمولی غفلت پوری امت کے لئے مہلک اور تباہ کن نتائج کی موجب بن سکتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہمارا ماضی نہایت تابناک رہا ہے اور ہمارا حال و مستقبل اس سے بھی روشن اور تابناک ہو سکتا ہے۔ ضرورت صرف احساس ذمہ داری اور اس کی انجام دہی کیلئے شعوری اور منظم جدوجہد کی ہے۔

انتشار امت اور علماء

مسائل دو طرح کے ہوتے ہیں، کچھ مسائل خارجی ہوتے ہیں۔ جو اپنی جگہ بہت سنگین اور اہم ہوتے ہیں۔ کچھ مسائل کا تعلق اندرون سے ہوتا ہے جن کو ہم داخلی مسائل کہہ سکتے ہیں۔ داخلی مسائل بسا اوقات خارجی مسائل سے زیادہ بھیانک اور ہلاکت خیزی میں کہیں بڑھکر ہوتے ہیں، ہمارے داخلی مسائل میں سب سے اہم انتشار و افتراق کا مسئلہ ہے جس نے امت کی جڑیں کھوکھلی اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کو ڈھا دیا۔ اس نے دشمنوں کو بھی دراندازی کا موقع دیا جس کے عبرتناک نتائج ہمارے سامنے ہیں فاعتبروا یا اولی الالباب ....

لیکن امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ اس کے پاس اتحاد کی جتنی اہم بنیادیں موجود ہیں کسی دوسرے نظام اور مذہب کو کبھی نہ میسر آسکی ہے۔ ہمارے درمیان کے اختلافات جزئیات میں ہیں۔ کلیات دین اور بنیادی مسائل میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کفر کا استیصال اور اسلام کا غلبہ، شرک کا خاتمہ اور توحید خالص کی دعوت، مسلمانوں کا تحفظ و بقاء اور شریعت اسلامیہ کی تنفیذ یہ وہ اہم اور بلند مقاصد ہیں جن پر امت کا اجماع ہے۔ مگر غم کا پہلو یہ ہے کہ اس عظیم بنیاد اتحاد کے میسر ہونے کے باوجود اغیار کی سازشوں اور طاغوتی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب ہماری صفوں میں زبردست انتشار ہے یہاں تک کہ قرآن و حدیث پر گہری نظر رکھنے والے علماء بھی اس سے محفوظ نہیں۔ ہماری

تاریخ ہم کو کچھ اور ہی سبق بتاتی ہے، حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور کی تاریخ دہرا لیجئے۔ تعبیر کتاب و سنت کے سلسلہ میں ان کے درمیان جو اختلاف رائے پیش آیا اس پوری تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ ہمیں نظر نہیں آتا جس نے جنگ و جدال کی صورت اختیار کر لی ہو۔ تمام اختلافات کے باوجود ائمہ و مجتہدین اور علماء کا ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھنا اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا اور آپس میں تبادلۂ خیال کرنا تاریخ کا زریں باب ہے۔

سیاسی مسائل میں مشاجرات صحابہؓ تکوینی حکمتوں کے ماتحت پیش آئے آپس میں تلواریں بھی چل گئیں ابتداء میں جب امام مظلوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ باغیوں کے نرغے میں محصور تھے اور یہی باغی نمازوں میں امامت کراتے تھے تو امام مظلوم نے مسلمانوں کو انکی اقتداء میں نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی اور کہا کہ ... "جب وہ لوگ نیک کام کریں اس میں ان کے ساتھ تعاون کرو اور جب کوئی برا یا غلط کام کریں اس سے اجتناب کرو۔" آخری دور خلافت میں جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان میدان جنگ گرم تھا، روم کی عیسائی سلطنت کی طرف سے موقع پاکر حضرت معاویہؓ کو اپنے ساتھ ملانے اور ان کی مدد کرنے کا پیغام ملا، تو حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ ہمارے اختلاف سے دھوکہ نہ کھاؤ اگر تم نے مسلمانوں کی طرف رخ کیا تو حضرت علیؓ کے لشکر کا پہلا سپاہی جو تمہارے مقابلہ کیلئے نکلے گا وہ معاویہ ہوگا"

حاصل یہ ہے کتاب و سنت کی تعبیر میں اختلاف رائے فطری ہے۔ لیکن اس میں شدت اور اس کیلئے ایک دوسرے سے برسرپیکار رہنے کا جواز کہیں سے نہیں ملتا۔ قرآن کریم انتشار کی ہولناک تباہی سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ	اور خدا اور اسکے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ تم بزدل ہو جاؤ گے

وَيَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ۔ (الانفال ۴۶)

اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی اور صبر سے کام لو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس میں بنیادی کردار صرف علماء و قائدین ہی ادا کر سکتے ہیں۔ امت تو آج بھی ان کے فیصلہ اور اقدام کی منتظر ہے —— ہم اپنے اسلاف کے اس اسوہ کی اقتدار کرتے ہوئے امت مسلمہ کے وسیع تر مفاد کی خاطر اور دشمنوں کی چالوں کو ناکام بنانے کے لئے کیا اپنے اندر حوصلہ پاتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے ایک چیلنج ہے۔

مسلکی اختلافات

یہاں میں مسالک کی ضرورت اور دین میں اس کی حقیقت و اہمیت پر گفتگو سے احتراز کروں گا کہ میرے موضوع سے نہ تو اس کا تعلق ہے اور نہ ہی اس کی چنداں افادیت۔ اس وقت صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ اس کی حیثیت خالص فروعی اور ثانوی ہے، دین کے بنیادی مقاصد اور امت کے وسیع تر مفاد کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایک طرف دین کے تحفظ اور اسلام کے غلبہ کا مسئلہ ہے۔ اسلامی تہذیب کا بچاؤ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا مسئلہ ہے دوسری طرف فقہائے کرام کے اجتہادی اختلافات۔ سوچئے تو سہی کہ اس میں کون اہم اور کون غیر اہم ہے، یہاں ہمیں اس پہلو سے بھی جائزہ لینا ہوگا کہ مسلکی اختلافات نے ہم کو کیا دیا؟ اگر واقعی اس سے انتشار کو شہہ ملی ہے اور یقیناً ملی ہے تو ہمیں اس کی تلافی کے لئے سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ مسالک کا کیا کیا جائے تو اس کے جواب میں صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ کام عقلاً ممکن ہے نہ درست کہ کسی مسلک کے پیروؤں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ ایک مسلک کو چھوڑ کر اس کے مسلک کو اختیار کرلیں۔ ایسی صورت حال میں کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہم ایک دوسرے کے تئیں کشادہ دلی

اور وسعت نظری کا رویہ اختیار کرتے، باہم دست و گریباں ہونے کے بجائے شیر و شکر ہو جاتے اور فرقوں اور مسلکوں کی جگہ اسلام اور صرف اسلام ہمارا شناخت بن جاتا۔ اس کے لئے بھی اقدام علمائے کرام ہی کو کرنا ہوگا۔ اپنے عمل سے اس کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا۔ تب کہیں جاکر مسلکی اور گروہی شدت میں کمی آئیگی اور اتحاد کی راہ ہموار ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی علمائے اہل حق کو چاہئے کہ قرآن و سنت میں گہرا اور کامل درک حاصل کریں اور اجتہاد کی صلاحیت پیدا کرکے جمود و تعطل کو توڑنے اور مسلکی شدت کو کم کرنے کی جانب پیش قدمی کریں۔ یہ کام گو کہ وقت طلب ہے تاہم ضرورت اس کی متقاضی ہے اور اسی میں پوری امت کی صلاح ہے۔

عالمی سازشیں

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اغیار کی سازشوں کا سلسلہ کوئی نیا نہیں۔ اس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ حق و باطل کی دائمی کشمکش کی تصویر قرآن نے بہت صاف بیان کی ہے اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ بہتر انجام حق اور اہل حق ہی کیلئے ہوتا ہے۔ ارشاد ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ (الانبیاء ۱۸)

بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے اور جھوٹ اسی وقت نابود ہو جاتا ہے۔

اس کشمکش کی عکاسی علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

باطل کی یہ اسلام دشمنی اور اغیار کی ریشہ دوانیاں نہ صرف یہ کہ ہر دور میں جاری رہی ہیں بلکہ شدت اور گھناؤنے پن میں اپنی مثال نہیں رکھتیں۔ یہ حق کے مقابلہ میں اپنے تمام باہمی اختلافات کو بھلا کر متحد ہو جاتی ہیں اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ان میں کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ الکفر ملۃ واحدۃ کی حقیقت یہاں بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔

آج کی دنیا پر ایک نظر ڈالئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کفر اپنے بچاؤ اور تحفظ کی خاطر متحد ہو چکا ہے۔ اور اسلام کے مقابلہ کیلئے جملہ اسلام دشمن قوتوں نے ایکا کر لیا ہے۔ اسلام کے مقابلہ میں آج ایسی قوتیں بھی مجتمع ہو چکی ہیں جن کے اتحاد کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی حقیر بنیاد بھی نہیں ہے بلکہ اتنا زبردست تاریخی اختلاف ہے کہ اس کو بھلانا ممکن نہیں۔ یہود و نصاریٰ کی متحدہ اسلام دشمنی اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ یہودیوں نے اپنے عقیدہ کے مطابق نصاریٰ کے ایک اہم پیغمبر کو قتل کر دیا۔ اس کے باوجود آج ان دونوں طاقتوں کو دیکھئے تو اسلام دشمنی میں دونوں ایک ہیں — ہمارے لئے ایک زبردست لمحہ فکریہ ہے کہ باطل طاقتیں اپنے مفاد کی خاطر بغیر کسی بنیاد کے ایک ہو سکتی ہیں تو کیا عظیم مقصد کے حامل اور پاکیزہ نصب العین کے علم بردار اپنے محبوب مقصود کے حصول کے لئے باطل کے خلاف باہم متحد نہیں ہو سکتے؟! جب کہ ہمارے اتحاد کی مضبوط ترین بنیادیں موجود ہیں — یقین جانئے کفر کے تسلط سے نجات اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے لئے مشترکہ جدوجہد اتحاد کے بغیر ممکن نہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

خلافت کا قیام اور علماء کا اتحاد

اللہ تعالیٰ کے مخلص اور چیدہ بندے یعنی انبیائے کرام زمین پر خلافت قائم کرتے رہے اور انکا سلسلہ خلافت راشدہ تک چلتا رہا۔ خلافت راشدہ کے بعد اس میں زبردست موڑ آیا اور کچھ دنوں تک امویوں اور عباسیوں کے ذریعہ بلاد اسلامیہ کا نظم و نسق چلتا رہا، پھر ترکوں کی رہی سہی عثمانی خلافت ۱۹۲۴ء تک قائم رہی، لیکن شاطران فرنگ اور کچھ دوسری طاقتوں نے ہمارے "اپنوں" کی مدد لے کر اس کی قبا چاک کر دی۔

یہاں یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی کہ خود خلافت عثمانیہ کے زوال کا ایک اہم سبب عربوں اور ترکوں کی قومی کشمکش ہے جس نے دشمنوں کے لئے ایک حسین

موقعہ فراہم کیا۔ ترکوں کی اس خلافت کے خاتمہ کے بعد بحالی خلافت کے لئے عالم تمام کے چیدہ علمائے کرام کی دو کانفرنسیں ہوئیں لیکن مکۂ مکرمہ کی دوسری اور آخری کانفرنس کے بعد یہ مسئلہ بھی معرض التوا میں جا رہا۔ خلافت کی جگہ قومی حکومتوں نے لے لی اور مسلمانوں نے خود اپنے ہاتھوں خلافت کا جنازہ نکال دیا۔

خلافت ارضی جماعت مسلمہ کا فرض منصبی اور نصب العین ہے اس کے تئیں سب سے بڑی ذمہ داری علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے۔ اس ذمہ داری کی واضح تصویر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں پیش کی گئی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔

بنی اسرائیل میں ایک نبی کے بعد دوسرا نبی آتا اور اسکا جانشین بن کر مشن نبوت اور کار خلافت کو آگے بڑھاتا۔ اسی طرح امت محمدیہ کے علماء پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں۔ اب انہی کو خلافت ارضی قائم کرنی ہے اور مشن نبوت کو لے کر انہیں کو آگے بڑھنا ہے۔

ایک متفق علیہ حدیث جس کا تذکرہ شروع میں کر چکا ہوں میں اس حقیقت کو اور واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ امت مسلمہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی آخری امت ہے جس کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے خود کیا اور اپنے دین کا قیام اور خلافت اسلامیہ کا احیاء جس کا مقصد قرار دیا۔ اسی طریقہ پر چل کر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم نے دکھایا اور جس کا عملی ثبوت ہر دور میں صلحائے امت نے پیش کیا۔ آج بھی تاریخ آپ کی طرف سے اس پیش قدمی کی منتظر ہے۔ یقین مانئے اگر علماء اپنے مقام پر خود قائم رہیں اور افتراق و انتشار کو شہ نہ دیں تو پوری امت ایک بار پھر متحد ہو سکتی ہے اور کوئی طاقت اس کو مٹا نہیں سکتی۔

آخری بات کے لئے میری نظر برصغیر کے جید اور مشہور عالم دین مولانا مسعود عالم

بقیہ صفحہ ۵۶ پر

سید انور گیلانی:

تاریخ کا سب سے بڑا مظلوم

زمانہ کا سب سے بڑا مظلوم۔ سیدنا حضرت امام حسینؓ سے بھی زیادہ۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان غنیؓ سے بھی زیادہ اور سید الشہداء حضرت حمزہؓ سے بھی کہیں زیادہ مظلوم۔ ان پر ظلم کیا ایک فرد نے یا زیادہ سے زیادہ ایک مختصر سی جماعت نے مگر مجھ پر ظلم کیا ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں نے۔ ان پر ظلم ہوا ایک خاص وقت میں ایک محدود خطہ میں اور مجھ پر ظلم ہوا دنیا کے گوشہ گوشہ میں۔ ہر زمانہ اور ہر دور میں۔ تیرہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مجھ پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ جبکہ گزشتہ دو صدیوں سے تو مجھ پر ایسا سخت ظلم ہو رہا ہے اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ظالم اپنے آپ کو ظالم مانتا ہے نہ اپنے ظلم سے باز آتا ہے اور نہ میری مظلومیت ہی کو خاطر میں لاتا ہے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں میں کون ہوں۔ میں وہی ہوں جو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا ہوں۔ حریری پردوں میں لپیٹ دیا گیا ہوں۔ جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوں۔ قسموں کے لئے مجھے اٹھایا جاتا ہے یا سر پر رکھا جاتا ہے۔ مجھے اس سے زیادہ وقعت دینے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں۔ شمال والے نہ جنوب والے۔ مغرب والے نہ مشرق والے۔

لیکن اگر اب بھی یہ سوال آپ کے پیش نظر ہو کہ آخر میں کون ہوں تو سنئے۔ میں صراطِ مستقیم ہوں میں حق و باطل کا امتیاز ہوں۔ میں ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ اور اللہ رب العالمین کی آواز ہوں۔ مجھے جن لوگوں نے اپنایا وہ جہانگیر و جہانبان بنے۔ عزت و سربلندی نے ان کے قدم چومے۔ زمانہ کے امام ہوئے اور جب مجھ سے روگردانی کی اور بیگانگی اختیار کی۔ مطعون ہوئے۔ مقہور ٹھہرے۔ جہانگیری گئی۔ جہانبانی چھوٹی۔ جہاں شہاں آزادی ہوئی، غلام بنے۔ پہلے اقوامِ عالم کے نگران تھے اب اقوامِ عالم ان کی نگران ہوئیں۔ قدرت نے انہیں آسمان سے اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ پھر زمین سے اٹھا کر قعرِ مذلت میں دھکیلا۔ اور یہ نادان اتنا بھی نہ سمجھ سکے کہ

انہیں کس جرم کی پاداش میں ایسی ہولناک سزا ملی ہے۔

ایک گروہ نے اٹھ کر کہا مغرب کی تقلید اس کا تریاق بن سکتی ہے۔ اس لئے اگر فلاح مقصود ہے تو مغربی تہذیب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناؤ ورنہ تہذیب و ترقی میں تم آج جس قدر پیچھے ہو اس سے کہیں زیادہ پیچھے رہ جاؤ گے۔

اس گروہ نے اپنا پورا زور اس نظریہ کی اشاعت اور ترویج پر صرف کر دیا۔ اور مغرب کی ایسی اندھی تقلید کی کہ کسی طرف کا ہوش نہ رہا۔ مغربی اقوام جس جس مراحل سے بھی گزریں یہ بھی انہی مراحل سے گزرے۔ انہوں نے سرمایہ داری کو اپنایا تو یہ بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے۔ انہوں نے کسب معاش سے ساری قیود اٹھائیں تو انہوں نے بھی ایسا ہی کرنے میں فخر محسوس کیا۔ وہاں شراب جائز ہوئی۔ سود پر معیشت استوار ہوئی تو انہوں نے بھی اسے جائز قرار دیا اور سود کی کاروبار کو ترقی کا ذریعہ تسلیم کیا۔ انہوں نے اختلاطِ مرد و زن کو ترقی کا نشان ٹھہرایا تو یہ بھی بے پردگی پر ایمان لے آئے اور اپنی عورتوں کو گھروں سے باہر نکال لائے۔ انہوں نے مذہب کو فرد کا ذاتی معاملہ بتایا تو انہوں نے بھی اسے فرد تک محدود رکھنے کے لئے طرح طرح کے استدلال سے کام لیا۔ ادھر مادہ ہی کو اول و آخر ٹھہرایا گیا تو ادھر سے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا گیا۔ غرض کہ جو جو راستے متعین کرتے گئے یہ بھی اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے گئے۔ اور نتیجہ میں جو کچھ رہا سہا پلے تھا اسے بھی کھو بیٹھے۔ ان کی چال سیکھنے کے شوق میں اپنی چال بھی بھول گئے۔ قومی شعار و وقار کھویا۔ عزتِ نفس اور خاندانی ساکھ مٹی۔ افلاس اور سرمایہ داری کے عفریت چمٹے۔ بداخلاقی و بے حیائی نے راہ پائی۔

اسی خبط میں مبتلا ہیں کہ مغرب پرستی میں جتنی زیادہ پختگی آتی جائے گی ترقی کا راہ اسی قدر کھلتی جائیں گی۔

ایک اور گروہ نے اٹھ کر کہا۔ اس دکھ کا مداوا تو مشرق پرستی میں ہے۔ مغرب پرستی میں نہیں۔ لہٰذا آباؤ اجداد کے دین کو اپنائے رکھو۔ ان کی وضع کردہ راہوں پر گامزن رہو۔ جیسا کچھ وہ کہتے اور کرتے رہے بس ویسا ہی تم بھی کرو۔ جتنی جتنی تم ان کی تقلید

کروگے ادبار کی گھٹائیں چھٹتی جائیں گی اور عالم میں تمہاری عزت و وقعت بنتی جائے گی۔

اس نظریہ کے مقلدین نے ہر برائی سے پرانی چیز کو اپنایا خواہ وہ بری ہی کیوں نہ تھی اور ہر اس نئی چیز کو ٹھکرایا خواہ وہ مفید ہی کیوں نہ تھی۔ پرانے طریقوں سے ذرہ برابر ہٹ کر چلنے والوں کی تکفیر کی اور ان سے یہاں تک تنفر برتا کہ ان کے دنیوی معاملات میں بھی شرکت کو ناگوار و نا روا سمجھا۔

پھر اس کے نتیجہ میں اس کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکے کہ بھائی بھائی سے متنفر ہو گیا ایک دوسرے کو مطعون کرنے لگا۔ کوئی کسی کو رجعت پسند کہتا تو کوئی پلٹ کر کافر و ملحد ٹھہراتا۔ اور یہ ملت شیر و شکر ہونے کی بجائے آپس ہی میں دست و گریباں ہو گئی۔ اور بجائے ترقی کے تنزل کی جانب تیزی سے گرنے لگی۔

امت مرحومہ کے دعوے دارو! میں کہتا ہوں تمہارے مرض کا علاج مغرب پرستی میں ہے نہ مشرق پسندی میں۔ تمہارا مرض تو اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے تم نے مجھے چھوڑا ہے۔ میرے بتائے ہوئے طریقوں سے منہ موڑا ہے۔ اب تم چاہے جہاں بھر کے معالجوں کو لے آؤ تمہارے مرض کا علاج ممکن نہیں۔ تمہارا علاج تو میرے پاس ہے۔ ذرا مجھے کھول کر تو دیکھو۔ اس میں تمہارے علاج کے لئے حضرت حق سبحانہ نے کیسے کیسے مجرب نسخے درج کر رکھے ہیں۔

قوم مسلم کہلانے والو۔ فی الواقع خوش قسمت قوم ہو کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ لیکن تم ہی اس وقت دنیا میں بد قسمت قوم بھی ہو۔ میں تمہارے پاس اس لئے بھیجا گیا تھا کہ تم میرے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرو اور خدا کی زمین پر خدا کے قانون کی حکومت قائم کرو۔ میں تمہیں عزت، سربلندی اور طاقت بخشنے آیا تھا۔ روئے زمین کی حکومت دینے آیا تھا۔ عرش الٰہی تک پہنچانے آیا تھا۔ مگر تم چند کلیوں پر ہی قناعت کر گئے۔ سمندر سے پانی کی چند بوندیں ہی مانگ کر رہ گئے۔ کلمہ طیبہ پڑھنے والو! تم نے مجھے چھوڑ کر، مجھ سے منہ موڑ کر بڑا ظلم کیا ہے۔ تم ظالم ہو۔ اور اسی ظلم کی پاداش میں تم طرح طرح کی آفتوں مصیبتوں اور بلاؤں میں گھرے ہوئے ہو۔ تمہارا چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ

الجھتا ہی جاتا ہے۔ تم چہار طرف سے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے ہو۔ تم ان سے نجات اپنے زور بازو سے کبھی نہ پا سکو گے۔ اور نہ تمہارے نوع بنوع کے استاد تمہیں ان دلدلوں سے نکال سکیں گے۔ سچ بتانا کبھی تم نے مجھ سے بھی پوچھا کہ تمہارے اعمال کیا ہونے چاہئیں تمہارے اخلاق کیسے ہوں؟ لین دین کس طرح کی جائے؟ دوستی اور دشمنی کن خطوط پر ہو؟ اطاعت کس کی کی جائے اور نافرمانی کس کی؟ دوست کون ہے اور دشمن کون؟

مجھے کتاب الٰہی ماننے والو تمہیں کامرانیاں ملیں گی تو میرے ذریعہ سے۔ عزتیں نصیب ہوں گی تو میرے واسطے سے۔ ترقی اور سربلندی ملے گی تو میری سیڑھی سے۔ سب طرف سے منہ موڑ کر اور پوری طرح یکسو ہو کر مجھ سے رجوع کرو پھر دیکھو دنیا تمہارے پاس ناک رگڑتی آتی ہے۔ اور اقوام عالم تم سے کسب کمال کرتے ہیں یا نہیں۔

تو فیر پانے کے خواہش مندو آؤ میری طرف اور چلو اس راہ پر جو رب کریم نے وضع کی ہے۔ کہیں قیامت نہ ہو جائے اور تم مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو اور مجھ پر ظلم روا رکھنے کی پاداش میں عذاب جہنم کا مزہ چکھو۔

غزل

ابو عمیر منظر اعظمی
متعلم جامعۃ الفلاح بلریاگنج۔

رہا ثابت قدم جب بھی کسی نے آزمایا ہے
دیار سنگ میں اپنا قدم کب ڈگمگایا ہے

گئے جب بھی وہاں زخموں کی چادر لے کے آئے ہیں
ابھی تیر اس کوچے میں اسے پھر بلایا ہے

یہ نازک آبگینے پھر نہ چلنا چور ہو جائیں
بہت کچھ سوچ کر میں نے تجھے اپنایا ہے

دکھائی دیتی ہے جو روشنی چاروں طرف تم کو
ہجوم تیرگی میں ہم نے اپنا گھر جلایا ہے

کرشمہ ہے تیری بد مست آنکھوں کا مگر ساقی
کہ میخانے میں زاہد آج اپنے آپ آیا ہے

خدایا قافلے کا اب مرے انجام کیا ہو گا
بصیرت سے جو عاری ہے اسے رہبر بنایا ہے

یہ دستور زمانہ ہے اسے کہیئے تو کیا کہیئے
جہاں پہ پھول رکھے تھے وہاں کانٹا بچھایا ہے

مطلع اتنا ابر آلود بھی نہیں ہے

سید حامد، سابق وائس چانسلر، ایم یو علی گڑھ

انسان پریشانیوں میں گھر جائے اور کملانے لگے تو امید کی ذرا سی کرن بھی آب حیات کا کام کر جاتی ہے۔ جس کسی کو جینے کا حوصلہ ہوتا ہے وہ بڑی مصیبتوں کا مقابلہ خم ٹھونک کر کرتا ہے اور چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو ڈھال بنا لیتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں پر بُرا وقت پڑا ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہر طرف سے حوصلہ فرسا خبریں آتی رہیں۔ مظلوم پر الزاموں کی یورش بھی ہو تو وہ بیچارہ کیا کرے۔ اس کے پاس کوئی چارہ اس کے سوائے نہیں رہتا کہ ہمت کسے اور دانت پیس کر میدان کارزار میں اتر آئے ——— میدان کارزار یعنی بے درد مقابلہ کی دنیا۔ مسلمانوں نے ہنوز ایسا کیا تو نہیں ہے لیکن کوشش کی آہٹیں مل رہی ہیں۔ قارئین مجھے معاف کریں اگر میں ان آہٹوں کی صدا کو اونچا کر کے دکھاؤں، یا سنواؤں۔

یہ دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمان ہندوستان کی آبادی کا تقریباً ۱۱ فیصد ہیں۔ آٹھ دس سال تک سول سروسیز کے مقابلہ میں ہر سال تقریباً ۹۰۰ سو کامیاب امیدواروں میں بارہ کے قریب مسلمان ہوتے تھے۔ گزشتہ دو تین سالوں میں یہ تعداد ۱۸ سے ۲۲ تک پہنچ گئی۔ امسال کل ۱۰۹۰ امیدوار چنے گئے جن میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے ۹۵ ہونا چاہئے تھی۔ کل ۲۴ مسلمان کامیاب ہوئے۔ یعنی ابھی منزل دور ہے لیکن یہ بات کیا کم ہے کہ چند سال ہوئے جہاں ہمارا تناسب ۱۲۲ اور ۱۵ ہوتا تھا وہ اب ۲٪ ہو گیا ہے۔ ہم پروردگار کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ایک محاذ پر تو ہمیں رجعت قہقری سے چھٹکارا ملا اور ہم نے آگے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا خواہ وہ رینگنے کی ہی شکل میں کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب کے ایماء پر اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی اعانت سے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے تعلیم آباد، سنگم وہار (جنوبی دہلی) میں جو مرکز سول سروسیز کے مقابلہ کے لئے کھولا ہے وہ سال بھر کی مختصر مدت میں حوصلہ افزا نتائج سامنے لایا ہے۔ پچھلے سال اس نے آٹھ لڑکوں کو امتحان کی آخری منزل یعنی پرسنلٹی ٹسٹ کے لئے تیار کیا۔ چار لڑکے کامیاب ہوئے امسال جس جماعت کو وہ شروع سے تیار کر کے لایا تھا۔ اس میں سے ۹ لڑکے دوسری منزل یعنی خاص تحریری امتحان میں کامیاب ہوئے، اور ۱۲ لڑکے آخری منزل کی تیاری کے لئے ان کے ساتھ شامل ہو گئے ان ۲۱ امیدواروں میں سے اس نتیجہ کے مطابق جو آج ۳ رجون ۱۹۹۳ء کو اخبارات میں شائع ہوا ہے، ۱۳ بفضلہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان میں دس مسلمان ہیں اور تین درج فہرست ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

فہرست حسب ذیل ہے۔

ذکی احمد، انجم پرویز، اصغر سہول، مظفر حسین، نورالدین انصاری، انظر شمس، اشتیاق حسین تکلیہ وارثی، ذاکر آر ڈی نظیم، نظام، تامیز وکندن، کے ایل مینا، سنیجے بادا۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ہمدرد اسٹڈی سرکل سے جتنے مسلمان طالب علم امسال کامیاب ہوئے ہیں اتنے ہندوستان کے کسی دوسرے ترتیبی مرکز سے نہیں ہوئے۔

یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ راقم سطور کی متواتر کوششوں کے بعد مرکزی سرکار نے مقابلہ کے امتحانوں کے لئے تربیت کی اسکیم منظور کی تھی۔ یہ ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے زیر اہتمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں روبہ عمل آئی۔ ہندوستان بھر میں ۵۲ کوچنگ سنٹر کھولے گئے۔ جہاں تک سول سروسیز کا تعلق ہے ان مراکز کے نتائج حوصلہ افزا نہیں رہے لیکن ان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان طلبہ کو یہ اطلاع مل گئی کہ محنت بازو سے اچھی ملازمتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ چھوٹی ملازمتیں، سرکاری اور نجی سیکٹر میں ان مراکز کے تربیت یافتہ طالب علموں نے معقول تعداد میں حاصل کی ہیں۔ مقابلہ کی ایک فضا تیار ہو گئی۔ اس سے بہت بہتر نتائج حاصل ہو سکتے تھے۔ اگر ان تربیت گاہوں کے سربراہ خلوص، محنت، لگن اور بصیرت سے

کام لیتے اور مسلم عوام اس پروگرام کا پورا فائدہ اٹھاتے۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے ہمدرد اسٹڈی سرکل کو قائم کرتے وقت ان کمیوں کو دور کر دیا۔ یہ اسکیم بغیر کسی بیرونی اعانت کے شروع کی گئی تھی لیکن بعد میں وزارتِ فلاح نے اپنی ترغیبی اسکیم کے تحت اسے جزوی امداد دینا منظور کر لیا۔ ہمدرد اسکیم کے تحت خوبی یہ ہے کہ اس میں طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بھی ہے۔ بہت بڑا کیمپس ہے۔ اس پروگرام کے تحت لائبریری، لکچر روم، ڈائننگ ہال، ایڈمنسٹریٹیو بلاک اور پچاس کمرے، فرنیچر اور ضروریات کے ساتھ ہر امیدوار کو ایک کمرہ الاٹ کیا جاتا ہے۔ اور صبح سے رات تک ڈائرکٹر کے زیر نگرانی طلبہ کو تیاری میں مصروف رکھا جاتا ہے۔ مختلف مضامین کے متخصصین لکچرار مذاکرات کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ یہ تاثرات عام ہو گیا ہے کہ پرسنلٹی ٹسٹ کی جتنی اچھی تربیت ہمدرد اسٹڈی سرکل میں ملتی ہے اتنی ہندوستان میں کہیں نہیں ملتی۔ ان انٹرویو بورڈوں میں جو مشق کے لئے تشکیل دیے جاتے ہیں، ہمیں مرکزی سروسیز کے نوجوان افسروں کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات انوکھی سی لگتی ہے مگر ہے امر واقعہ کے مطابق کہ جہاں تک سول سروسیز کا تعلق ہے، یو پی سی کے ۵۳ اور وزارت فلاح کے ۲۹ مراکز نے مل کر بھی کامیابی کی وہ منزل طے نہیں کی جو ہمدرد اسٹڈی سرکل اپنی مختصر عمر کے دوران طے کر پایا ہے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ محنت باقاعدہ محنت اور لگن شرط ہے، کوئی کام ایسا نہیں جو انجام نہ دیا جا سکے۔ افسوس اس بات کا ضرور ہے کہ مسلمانوں کی قیادت نے انہیں تعمیری کاموں سے سدا دور رکھا اور حکومت انہیں کھلونے دے کر بہلاتی رہی۔ کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ مسلمانوں کو تعلیم و تربیت اور مقابلے کے میدان میں اتار دیتی۔

خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ آج کی سادہ سی کامیابی کل کی شاندار فتوح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر محمد فاروق اعظم (بھاگلپور)

اقبال اور زندگی کا اعلیٰ نصب العین

علامہ اقبال کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ ان چھ سات دہائیوں میں انکی شخصیت، فکر و فن، فلسفۂ حیات اور ان کے مخصوص نظریۂ تمدن پر مختلف جہات سے روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اقبالیات پر جس قدر لکھا جا رہا ہے اسی قدر لکھنے کی خواہش بڑھتی ہے۔ عظمت اقبال کی یہ ایک بڑی پہچان ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ جس دردِ دل کو بے نقاب کیا ہے اور عشق کی فریاد جس انداز سے پیش کی ہے اسکی تاثیر بے انتہا ہے۔ یہ سب انکی فریاد کی تاثیر ہی کا نتیجہ ہے کہ لکھنے والے ایک مخصوص دلچسپی کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور پڑھنے والے اس سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی　　　اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

علامہ اقبال کے فکر و تخیل سے اردو اور فارسی زبان و ادب کو جو وسعت حاصل ہوئی ہے علمی اور ادبی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انہوں نے اپنے فکر و فن کے ذریعہ زندگی کے تصور کو وسیع تر کر دیا اور ہمارے ذوق کی نشو و نما کے لئے نئی راہیں نکالیں۔ انہوں نے اپنے فکر و فن سے ایک سوئی ہوئی ملت کو بیدار کیا اور زوال کے زمانے میں عروج کے خواب دکھائے۔ کبھی اپنے دل آویز نغموں سے سامعین کے دلوں کو بھایا، کبھی انکی عظمت گذشتہ کے نقشے انکی آنکھوں کے سامنے کھینچے، کبھی اشاروں اشاروں میں اپنے قافلے کے "ہمرہانِ سست عناصر" کو تیز گامی کی دعوت دی اور کبھی اپنا جذبۂ دل نالہ و فریاد کے ذریعہ ظاہر کیا۔ وہ ایک مردِ قلندر تھا جو ہم میں آیا اور اپنے نغموں سے ہمارے اندر روحِ حیات پھونکنے کی کوشش کی اس کے

حجازی نغمے آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں اور اسکی فریاد ہمارے دلوں کو متاثر کر رہی ہے۔

لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اقبال کے ساتھ آج تک انصاف نہیں ہو سکا ہے۔ ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی آج بھی موجود ہے جو اقبال کو یا تو شاعر ہی نہیں مانتے یا پھر انکی شاعری کو فلسفے کی شاعری کا نام دے کر اس سے پہلو تہی کر جاتے ہیں۔ اور دوسرے شاعروں کے مقابلے میں انکی شاعری کو وقعت نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک مقصد وجود کا ادراک نہیں ہو سکا ہے "ہمارا مقصد وجود کیا ہے" اس سوال پر ہم نے سنجیدگی سے کبھی نہیں سوچا "ہمارا نصب العین کیا ہو؟" ہم نے اس پر کبھی غور نہیں کیا اور اگر بہت ہوا تو اپنی زندگی تک ہی اسے محدود رکھا شعر و ادب کی دنیا کو تو اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔

اس کے برخلاف علامہ اقبال نے مقصد حیات کو سمجھا اور ایک متعین نصب العین کو اختیار کر کے اپنی ذاتی اور انفرادی زندگی ہی میں بلکہ اجتماعی اور عوامی زندگی میں اسے ملحوظ رکھا اور اپنے فن کے ذریعہ نہ صرف اسکی تشہیر اور اشاعت کی بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کو اسے اختیار کرنے کی تلقین بھی کی۔

علامہ اقبال نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا وہ بڑا پُر فتن دور تھا مغربیت زدہ دنیا اور خاص کر مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے مقصد وجود کو بھلا دیا تھا اور اپنی زندگی کے اعلیٰ نصب العین سے دور ہوتے چلے گئے تھے اسلام نے جن قوانین فطرت اور اصول حیات سے انہیں نوازا تھا وہ انہیں بڑی تیزی سے فراموش کر رہے تھے۔ نتیجتاً ملت اسلامیہ کی تمام خصوصیات مٹ رہی تھیں اور وہ شان امتیاز ختم ہو رہی تھی جسکی بنا پر گزشتہ زمانوں میں وہ تمام نوع انسانی پر فائق رہی اور جسکی وجہ سے اسے شہداء علی الناس ہونے کا مرتبہ حاصل تھا۔ چونکہ اسکی یہ فوقیت اور عظمت اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ وہ آئین الٰہی کی پابندی کرے گی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا فریضہ منصبی ہوگا لیکن جب اس نے قانون الٰہی کی پابندی چھوڑ دی اور اپنے اعلیٰ نصب العین کو ترک کر دیا تو اسکی فوقیت اور شان آپ سے آپ ختم ہونے لگی اور مایوسی اور اضمحلال کی شکار ہوتی چلی گئی

ملت اسلامیہ کی یہ حالت زار علامہ کی نظروں سے اوجھل نہ رہی۔ ملت کے اندر مرور ایام سے جو عیوب پیدا ہو گئے تھے عقائد میں جو فساد در آیا تھا اعمال میں جو خرابی آگئی تھی اس کا دردناک احساس علامہ اقبال کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" پر نظر ڈالیے "شکوہ" میں یہود و نصاریٰ کی ذہنیت نظر آتی ہے۔ یہود و نصاریٰ ہی تو کہا کرتے تھے کہ ہم خدا کی منتخب قوم ہیں، ہم ہی اسکے چہیتے ہیں اس لئے دوسروں کے مقابلے میں ہمیں کسی حال میں بھی ذلیل اور بے بس نہیں ہونا چاہیئے، اعمال کا کوئی سوال نہیں، ہمارے عقائد تو برقرار ہیں۔ ہم ابھی اپنے خدا کو مانتے ہیں، اپنے رسول صلعم کو برحق جانتے ہیں اور خدا کی نازل کردہ کتاب کو سراپا صداقت تسلیم کرتے ہیں۔ خدا کو یہ تو نہیں چاہیئے تھا کہ وہ اپنوں کو ذلیل کر دے اور تمام نوازشوں کی بارش اغیار پر کرے۔ اقبال کا یہ شکوہ انکی اپنی آواز نہیں ہے۔ اس میں انہوں نے عامۃ المسلمین کی غیر شعوری کیفیات بیان کر دی ہیں کہ مسلمان یوں محسوس کرتے، یوں کہتے اور یوں سمجھتے ہیں۔ اس شکوہ میں مسلمانوں نے اپنے اعمال کی کوتاہی نظر انداز کی ہے یا اسے بہت مدھم آواز میں بیان کیا ہے۔ انکے زیادہ تر شکوے کا انداز یہی ہے کہ:

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پر آخر ہیں تمہارے

انہوں نے اپنی موجودہ زندگی میں سے ایک بھی خوبی کا حوالہ نہیں دیا ہے اپنی کوتاہیوں کا انکار تو وہ کر نہیں سکتے تھے لیکن اپنا بچاؤ انہوں نے یوں کیا ہے کہ اگر یہ سب کچھ گناہوں کی پاداش میں ہے تو گنہگار صرف ہم ہی نہیں ہیں۔ دوسری قومیں بھی اعمال و عقائد کے لحاظ سے ہم سے کم نہیں، ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار:

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں　　عجز والے بھی ہیں مست مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں　　سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر　　برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

مسلمانوں کے اعمال اور انکی سیرت کا صحیح نقشہ وہی ہے جو جواب شکوہ میں خدا کی زبان

ادا ہوا ہے۔ خدا نے مسلمانوں کی شکایت بے جا کا جواب دیا ہے کہ تم کہتے ہو کہ خدا اغیار پر کرم کرتا ہے اور ہم پر نہیں، تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ حصولِ کرم کے لئے کچھ لازمی شرائط ہیں۔ کوئی راستہ چلنے والا ہو تو اسکی منزل کی طرف رہنمائی کی جائے۔ کوئی جوہر قابل ہو تو اس کی تربیت کا سامان ہو ؎

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں　　ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ منہ پر لا الٰہ الا اللہ اور دل میں صنم خانہ حرص و ہوا ؎

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں　　امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں　　تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

تم کو شکایت ہے کہ اغیار اچھے مکانوں میں رہتے ہیں۔ اچھے گھر تو علم و فن اور ہمت سے بنتے ہیں اور تم علوم و فنون سے بے بہرہ ؎

جنکو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو　　نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تمہیں تو شکوہ بے جا کرنے بھی نہیں آتا ؎

کیا کہا بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور　　شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور　　مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں　　جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

مسلمانوں کی حالتِ زار اس حد تک پہنچ گئی تھی جہاں پہنچ کر ان کے دل سے احساسِ زیاں بھی جاتا رہا ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

علامہ اقبال نے جب دیکھا کہ دین و دنیا دونوں کے متعلق مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ غلط ہو گیا ہے اور اسی لئے وہ خسرانِ دنیا و آخرت میں مبتلا ہیں تو انکے ذہن میں یہ بات آئی کہ مسلمانوں کو اس قعرِ مذلت سے نکالنے کے لئے حکمت سے کام لیا جانا چاہیئے حکمت کو سوز

عشق سے گرمایا کر اور شعر کی اثر آفرینی سے کام لے کر ان کے نفوس میں انقلاب پیدا کرنا چاہیئے مسلمانوں کی آرزوئیں غلط ہو گئی ہیں، انکی آرزوؤں کو بدلا جانا چاہیئے۔ اس قوم کا حقیقت میں کوئی نصب العین نہیں رہا ہے اس لئے انکی کوششیں بے نتیجہ یا مضر ثابت ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی ایک تصنیف "فکرِ اقبال" میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"ایک روز علامہ اقبال نے میرے سامنے "شمع و شاعر" کے اس شعر کی شرح فرمائی ؎

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں　　تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا

فرمانے لگے کہ ہماری قوم کے دیندار ہوں یا دنیا دار، انکا میدان عمل نہایت تنگ ہوتا ہے اور محمل بے لیلیٰ وہ دل ہے جسمیں مقصودِ زندگی اور غایتِ حیات کا کوئی ایسا تصور نہ ہو جو اپنی کشش سے انسانوں سے مجنونانہ جد و جہد کروا سکے بڑے بڑے کام عشق یا جنون ہی سے ہوتے ہیں۔ جہاں میدان عمل تنگ ہے اور محمل میں لیلیٰ ہی نہیں وہاں قیس جیسے مجنوں کہاں پیدا ہونگے؟ افسوس ہے کہ اس قوم کا کوئی نصب العین نہیں۔ ہر فرد اپنے مفادِ عاجلہ میں لگا ہوا ہے اور اپنی ذات سے باہر اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس میں کوئی زندہ تمنا نہیں جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے"۔

اقبال کے یہاں اسلام، مسلم اور آدم کے نصب العینی تصورات واضح طور پر ملتے ہیں۔ انکے نزدیک اسلام حیات و کائنات کی ازلی و ابدی صداقتوں کا نام ہے۔ جہاں تک دورِ حاضر کے مسلمانوں اور عام انسانوں کا تعلق ہے یہ سب کے سب زندگی کے اس نصب العین سے بہت دور جا چکے ہیں۔ اس وقت اسلام پیش کرنے والوں کے اعمال و نظریات سے علامہ موصوف کچھ مطمئن نہ تھے اسلام اور مسلمان دونوں کی صورتیں مسخ ہو چکی تھیں۔ خیر امت ہونے کے ناطے مسلمانوں پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں وہ فراموش کر چکے تھے۔ آدم کی اولاد اپنی حیثیت اور مقام بھول چکی تھی۔ اس صورت حال میں اقبال نے آدم کا جو تصور دیا ہے وہ قرآنی ہے جس میں انسان کامل نائبِ الٰہی اور مسخرِ کائنات ہے۔ اقبال انسان کے پیدائشی طور پر فی احسن تقویم ہونے کے قائل ہیں لیکن انکا یہ بھی ماننا

کہ موجودہ انسان اسفل السافلین کے درجہ میں گر چکا ہے۔ از روئے قرآن بیشتر انسانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ صرف جانوروں کی طرح ہیں بلکہ وہ ان سے بھی گرے ہوئے ہیں "اولئک کالانعام بل ھم اضل"۔ اقبال خدا سے سوال کرتے ہیں کہ کیا یہی آدم جو سامنے نظر آتا ہے زمین پر تیرا خلیفہ ہے جسے نہ اپنی سمجھ ہے نہ خدا کی اور نہ کائنات کی ؎

یہی انساں ہے سلطاں بحر و بر کا ؟ کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا ؟

لیکن قوم و ملت اور پوری دنیا کی اس مایوس کن حالت کے باوجود اقبال مایوسی کو کفر سمجھتے ہیں فرماتے ہیں ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

علامہ اقبال زندگی بھر اس زرخیز مٹی یعنی امت مسلمہ کو نمی پہنچانے کی سعی کرتے رہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ تمام انسانوں کو درس انسانیت دیتے رہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو انکی بھولی ہوئی ذمہ داریاں اور ان کا مقصد وجود امر بالمعروف و نہی عن المنکر یاد دلاتے رہے۔ انہوں نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ امت مسلمہ کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ عالمی قیادت کا اپنا کھویا ہوا منصب سنبھالے، تہذیب و تمدن اور صلاح و معاشرہ کو صحیح سمت عطا کرے اور ساری انسانیت کو بربادی و ہلاکت کی راہ سے بچا کر کامیابی و کامرانی کی شاہراہ پر لے آئے۔ اس لئے کہ دنیا میں یہی وہ امت ہے جس کے پاس ایمان و یقین کی لازوال طاقت ہے۔ جو کل انسانیت کے لئے ایک زندہ و پائندہ پیام کی حامل ہے اور جس میں انسان اور انسانیت کے سارے دکھوں کا مداوا ہے۔ سارے عالم کی رہنمائی کی ذمہ داری اب اسی پر عائد ہوتی ہے۔ اس عالم میں دینی حیثیت امر و نہی کی حیثیت رکھتی ہے اور باطل طاقتوں اور ان کے بنائے ہوئے نظاموں کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ امت مسلمہ اپنے ایمان اور اعمال کی اصلاح کرے اور خیر امت ہونے کی حیثیت سے اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں کما حقہ ادا کرنے لگے۔

علامہ اقبال کا تصور خودی انفرادی خودی اور اجتماعی خودی دونوں پر محیط ہے انفرادی خودی یہ ہے کہ آدمی اپنی ہستی اور اپنی ذات کا عرفان حاصل کرے اور اپنی وقعت کو پہچانے خصوصًا ایک مسلم فرد کو یہ احساس ضرور ہو کہ وہ اس کارزار حیات میں شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع و فرماں بردار بندہ ہے اور وہ اس امت کا ایک فرد ہے جسے قرآن خیر امت کہتا ہے اسی طرح اجتماعی طور پر پوری ملت کو یہ احساس ہو کہ وہ کس منصب عالی پر فائز ہے اور اسے کن مقاصد کے پیش نظر وجود بخشا گیا ہے نیز اسے اس بات کا بھی قوی احساس ہو کہ اس کے پاس قرآن و سنت کی شکل میں وہ سارے سیلے موجود ہیں جن کے سہارے وہ پوری دنیا پر اللہ کے احکام نافذ کر سکتی ہے۔ اور تمام انسانوں کی قیادت کر سکتی ہے اسے کوئی بھی چیز کسی دوسروں سے مستعار لینے کی قطعًا ضرورت نہیں۔

علامہ اقبال چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں خودی بیدار ہو اور وہ دنیا میں اسلامی نظام حیات قائم کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد شروع کر دیں اللہ کا شکر ہے کہ علامہ اقبال کے انتقال پر ملال کے فورًا بعد ہی برصغیر میں اقامت دین کے لئے اجتماعی جدوجہد شروع ہو گئی اور آج دنیا کے ہر حصہ میں اقامت دین کی خاطر تحریک اسلامی سرگرم عمل ہے لیکن ابھی کام بہت باقی ہے۔

"قائد تحریک اسلامی ہند نمبر" کا دوسرا ایڈیشن

مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی کے حالات زندگی اور خدمات پر مشتمل "حیات نو" کی خصوصی پیشکش "قائد تحریک اسلامی ہند نمبر" ضروری تصحیح کے بعد دوبارہ منظر عام پر آچکا ہے۔ خواہش مند حضرات جلد رابطہ قائم کریں۔

قیمت : ۱۵ روپے

عبدالحمید فاضلی ندوی

مولانا مسعود عالم ندویؒ

"ایک بلند پایہ عربی ادیب"

مولانا مسعود عالم ندوی کے ادبی مقام کو سمجھنے کے لئے چند تمہیدی باتوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں عربی زبان وادب کے تاریخی پس منظر کو بھی مد نظر رکھنا ہوگا۔ اس کے بغیر صحیح طور سے ہم ان کی ادبی خدمات کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ اور عربی کے اس ہندوستانی انشاء پرداز کے مقام ومرتبہ کو متعین کرنے میں دشواری پیش آئے گی۔ برصغیر عربی زبان سے اصلاً اسی وقت آشنا ہوا۔ جب عرب تاجروں نے یہاں کے ساحلی علاقوں میں تجارت کی غرض سے آمد ورفت شروع کی۔ اور یہاں کے لوگوں سے میل جول بڑھایا۔ عربوں کے اخلاق وعادات سے یہاں کے لوگ نہ صرف متأثر ہوئے، بلکہ انکی زبان کی چاشنی نے بھی ان کو عربوں کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔ جب پہلی صدی ہجری کے آخر میں سندھ پر عربوں نے حملہ کیا۔ تو شمال مغربی ہند کے اس مفتوحہ علاقہ میں بھی عربی زبان کا رواج ہوا۔ لیکن عرب فاتحوں کے جلدی واپس لوٹ جانے کے باعث یہ اثر زیادہ دور رس ثابت نہ ہوا۔ اور یہاں وہ حالت قائم نہ ہو سکی۔ جو عرب فاتحوں کی وجہ سے افریقہ اور یورپ میں ہوئی تھی کہ وہاں کی زبان ہی بدل گئی۔ اور پورے ملک میں عربی ہی عوام وخواص کی زبان بن گئی۔ یہاں صرف انہی علاقوں نے عربی زبان کا اثر قبول کیا جنہیں عربوں سے کسی طور سابقہ پیش آیا۔ اور وہ بھی صرف اس حد تک کہ ان زبانوں میں عربی کے متعدد الفاظ کا رواج عام ہوا۔ اور یہ عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں۔ سندھی زبان میں دوسری علاقائی زبانوں کی نسبت اسی وجہ سے عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ اور سندھی کا رسم الخط بھی خالص عربی نسخ کا ہے۔ ہندوستان میں عربوں کے اس مختصر قیام ہی کا نتیجہ تھا کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز

سے لے کر تیرھویں صدی ہجری کے اواخر تک اس ملک میں معدودے چند کو چھوڑ کر کوئی عربی کا ادیب اور انشاء پرداز پیدا نہ ہو سکا۔ اور ان میں بھی اکثر وہ لوگ تھے جنہوں نے ترک سکونت اختیار کر کے عرب ہی میں اپنی سکونت اختیار کی تھی۔ اور وہیں ان کی ادبی صلاحیتیں بھی اجاگر ہوئیں یا پھر انہوں نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ دیار عرب میں گذارا۔ عربی کے مشہور ادیب اور تاج العروس کے مصنف مرتضیٰ زبیدی بلگرامی اگرچہ ہندی الاصل تھے لیکن یہاں سے ہجرت کر کے عرب چلے گئے اور قاہرہ میں انکا انتقال ہوا۔ اس ملک میں عربی علوم وادب کے ترویج کے تاریخی پس منظر کو مزید سمجھنے کے لئے ہمیں مولانا عبدالرحمن الکاشغری الندوی کے عربی دیوان "الزہرات" کے مقدمہ میں مولانا مسعود عالم ندوی ہی کے قلم سے چند سطریں ملتی ہیں۔ اس مقدمہ سے اس ملک میں عربی زبان وادب کا تاریخی پس منظر خاصہ واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں۔

"ہمارا ملک برصغیر ہند وپاک ان خوش نصیب ملکوں میں ہے جہاں عرب تاجروں اور مجاہدوں کے قدم آچکے ہیں۔ اگرچہ وہ زیادہ دنوں قیام نہ کر سکے اور آخر کار انکی آمد ورفت کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا۔ اسی لئے عربی زبان یہاں وہ فروغ حاصل نہ کر سکی جس کے ہم مستحق تھے۔ ہاں چند شاعر عربی کے ضرور پیدا ہو گئے جنکی پختہ کلامی اور عربی ذوق کی صحت سے انکار نہیں۔ لیکن یہ حال سندھ کا ہے جہاں عربوں کی آمد ورفت رہی تھی سندھ کے علاوہ ملک کے دوسرے حصے جہاں عرب مجاہدین آئے ہی نہیں۔ بلکہ مغلوں ترکوں اور افغانیوں کی جماعتیں آتی رہی ہیں۔ وہاں قرآن کریم کی زبان جس کس مپرسی میں رہی اور جس درجہ اس کی مٹی پلید ہوئی۔ اور جس قدر عامیت کا شکار رہا۔ اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ رہے وہ حضرات جو زمانے کی ناسازگاریوں کے باوجود عربیت کو سینوں سے لگائے رہے۔ اور اس کے درس وتدریس میں مشغول رہے۔ انہوں نے اگر کبھی عربی میں کچھ لکھا لکھایا، تو ان کی تحریریں حافظ ابراہیم کے ان دو شعروں کا مصداق تھیں

سرت لوثۃ الاعجام فیہا کما سری ۔۔۔ لعاب الافاعی فی مسیل فرات

فی نوت کتوب شعر صحیح رقعہ　　مشکوٰۃ الانوار محمد تقی

چند ماہرین فن کو چھوڑ کر جنہوں نے زبان وادب کو صحیح طریقے پر حاصل کیا، کسی کو بھی اس علوم سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح طریقہ اختیار کرنے والے وہ لوگ ہیں، جنہوں نے عرب ممالک کا سفر کیا۔ اور زبان وادب میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ ان لوگوں میں عربیت کا پایہ بہت بلند ہے۔ جیسے شاہ ولی اللہ اور سید مرتضیٰ زبیدی یا ان کی طرح اگر کسی اور نے یہ کمال حاصل کیا ہو۔ جبکہ[1] آٹھویں صدی ہجری سے لیکر بارھویں صدی ہجری کے اواخر تک کا زمانہ خود عربی ممالک میں عربی زبان وادب کے اعتبار سے تاریک تھا۔ پورے عالم عرب پر ظلمت کا سایہ تھا۔ زبان وادب کا انحطاط تھا۔ جس سرزمین نے ایک ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں عربی زبان وادب کے بڑے بڑے مصنفین اور نقاد پیدا کئے اور جن کا نام آج بھی روشن ہے جنہوں نے عربی زبان وادب کو انتہائی عروج تک پہنچایا تھا۔ میری مراد ان سے حافظ ابن العمید صاحب بن عباد بدیع الزماں ہمدانی، ابوالفرج اصفہانی، ابن جریر اور طبری وغیرہ جیسے مصنفین ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس سرزمین سے اس کے بعد پانچ سو سال کے طویل عرصے میں سوائے ابن خلدون کے کوئی قابل ذکر ادیب پیدا نہ ہوا۔ عالم عربی ابھی جمود اور ظلمت کے دور سے گزر رہا تھا کہ تیرھویں صدی کے آغاز میں یورپ نے اپنے زبردست حملوں سے عربی ممالک کو نیند سے بیدار کیا۔ ان کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اس وقت یکایک عربوں کو احساس ہوا۔ کہ یہی یورپ جس کو انہوں نے آج سے چودھویں صدی قبل علم وحکمت کی روشنی عطا کی تھی۔ اب جدید علوم وفنون سے مسلح ہو کر سامنے کھڑا للکار رہا ہے۔ چنانچہ اس انقلاب کو دیکھتے ہوئے اہل عرب نے تعلیم کو فروغ دینے کی زبردست کوشش شروع

۱؎ "ترجمہ" عربی زبان میں عجمیوں کی ژولیدہ بیانی اس طرح سرایت کر گئی جیسے نہر فرات کے بہاؤ میں اژدھوں کے زہر پھیل جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تحریریں ایسے کپڑوں کی طرح ہو گئیں جن میں لاتعداد رنگ برنگ کے پیوند لگے ہوں۔

* المزہرات صفحہ بحوالہ چراغ راہ مسعود عالم ندوی نمبر ۱۹۶

کی۔ اس زمانے میں مصر کو محمد علی جیسا منتظم اور سربراہ میسر آ گیا۔ اس نے صرف ملکی تعلیم وتربیت پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ مصری نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں بھیجا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان وادب میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے وہ عروج وترقی حاصل کی کہ اموی اور عباسی دور کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر آ گیا۔ انیسویں صدی میں عرب ممالک میں عربی زبان وادب کو کافی فروغ حاصل ہوا بلکہ یہ عربی زبان اور اس کے آداب وفنون کی نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ اس صدی میں زبان وادب کی تجدید شروع ہوئی۔ اور بیسویں صدی کے نصف تک پہنچتے پہنچتے نقطہ کمال کو جا پہنچی۔ اس طویل عرصہ میں عربی کے بے شمار ادباء، انشاء پرداز، مصنفین، صحافی، شاعر اور نقاد پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنی علمی وفکری کاوشوں سے عربی زبان کے علم وادب میں بیش قیمت اضافے کیے۔ اور ان میں سے بعض یورپ کے بڑے بڑے اہل فکر اور ارباب علم وادب سے بھی آگے نکل گئے۔ اور دوسری طرف قوت بیان، زور کلام اور بلاغت میں اموی اور عباسی زمانے کے اہل کمال کے مقام کو پہنچے۔ ان کے سرخیل عالم اسلام کے مشہور فلسفی رہنما اور اتحاد بین المسلمین کے سب سے اول داعی جمال الدین افغانی تھے۔ جنہوں نے اپنی پراثر شخصیت، بلندئ فکر، قوت عزم سے عربوں کو نیند سے بیدار کیا۔ ان کے اندر نیا جوش وولولہ پیدا کیا۔ وہ افغانی ہونے کے باوجود عربی زبان کے ایک باکمال انشاء پرداز تھے۔ مصر میں آٹھ سال رہنے کے بعد جب انہیں وہاں سے نکالا گیا۔ تو پیرس میں انہوں نے اپنے شاگرد خاص مفتی محمد عبدہ کے ساتھ مل کر ایک عربی رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا جو اپنے زور بیان میں ضرب المثل تھا۔

مفتی محمد عبدہ نے علمی اور تعلیمی حلقوں میں اپنی اعلیٰ اور جاندار فکر سے ایک انقلاب پیدا کیا۔ اور عربی زبان کی اصلاح وترقی میں بھی ایک مجددانہ کارنامہ انجام دیا۔ پھر مفتی محمد عبدہ کے شاگردوں اور جانشینوں کا ایک سلسلہ چلا۔ ایک کثیر تعداد نے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی علمی اور ادبی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیا۔

ان میں سے چار کا نام سرِ فہرست ہے۔ ایک مصر کے مشہور عالم، مفسر اور ادیب سید رشید رضا، دوسرے اپنے وقت کے سب سے بڑے شامی نثر نگار امیر شکیب ارسلان، تیسرے شام کے مقالہ نویس عبد القادر المغربی اور چوتھے مصطفیٰ صادق الرافعی۔

اس طرح سے ایسے ادباء کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ جن کی ادبی تحریریں کسی دوسری صدی کے مصنفین اور ادباء سے معیار میں کم نہیں تھیں۔ جہاں جہاں "العروۃ الوثقیٰ" پہنچا۔ وہاں وہاں ان حضرات کا اسلوب نگارش بھی پہنچا۔ پھر اس حلقہ کے بیشتر افراد صرف ادیب اور شاعر یا محض صحافی ہی نہ تھے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دین اور شریعت پر ان کی گہری نظر بھی تھی۔ آج ہندوستان میں کتنے ہی حضرات ایسے ہوں گے۔ جو سید رشید رضا کو صرف ایک مفسر قرآن کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ہندوستان اور عرب کے درمیان جب باہمی روابط پیدا ہوئے اور کتب و رسائل کا تبادلہ ہونے لگا۔ تو عرب ادباء اور اہل قلم کے اسی گروہ کی علمی کاوشیں اور افکار ہندوستان میں زیادہ عام ہوئے۔ اور انہی حضرات کی تحریریں زیادہ مقبول ہوئیں یہی وجہ ہے کہ یہاں متقدمین میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبد الحمید فراہی اور عبد الحی لکھنوی وغیرہ اور متاخرین میں سید سلیمان ندوی، علامہ عبد العزیز میمنی، مولانا عبد الرحمٰن کاشغری اور ندوۃ العلماء کے دوسرے اساتذہ پر عربی ادب و انشاء کے اسی حلقہ کا پرتو پڑا۔ ان سب کے کلام میں جو چیز مشترک نظر آتی ہے۔ وہ سادگی اور وضاحت پسندی ہے۔ ان کی ضخیم و اہم تصنیفوں سے لیکر چھوٹے چھوٹے مقالوں تک ہمیں کہیں بھی عبارت میں کوئی کجی ترکیب میں کوئی پیچیدگی اور معانی میں کوئی ابہام و تعقید کا پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ اسلام پسندی اور شریعت الٰہی سے بے پناہ وابستگی ان کے کلام میں روح کی طرح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ اور یہی وہ صفات

ہیں جن کا اثر ندوۃ العلماء کے علمی و ادبی ماحول پر پوری طرح پڑا۔ ندوۃ العلماء نے اس اثر کو نہ صرف یہ کہ قبول کیا۔ بلکہ اس کو ادارے کی اساس قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلماء سے ایسے ایسے باکمال ادیب پیدا ہوئے، جن کی ادبی قدر و قیمت کا لوہا خود عرب ممالک کے ادباء نے مانا ہے۔ مثلاً مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا عبد الرحمٰن کاشغری ندوی وغیرہ وغیرہ

"مسعود عالم ندوی اور عربی زبان و ادب"

مذکورہ بالا علمی و ادبی ماحول میں مسعود صاحب نے عربی زبان و ادب کی تحصیل کی۔ ان ادیبوں کی تصنیفات نے آپ کے عربی زبان و ادب کے ذوق کے نمو میں گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان اثرات کے زیر سایہ آپ کا عربی اسلوب تیار ہونے لگا۔ اپنے اساتذہ کی طرح آپ نے بھی ان خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور عربی ادب و انشاء میں وہ قدرت حاصل کی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ نیز آپ کے فطری ذوق اور وہبی صلاحیتوں نے عربی ادب کے فن کو مزید نکھارا۔ قدیم ماخذ کے گہرے مطالعہ اور جدید لٹریچر اور خاص کر امیر شکیب ارسلان، سید رشید رضا کی تصنیفات سے براہ راست استفادہ نے آپ کے عربی ادب کو ایک صحیح اور معتدل نیز سلاست اور روانی سے بھرپور اسلوب مہیا کیا۔ لیکن جس چیز نے آپ کے فن اور ہنر کو زیادہ نکھارا فصاحت و بلاغت کا بے مثال جوہر پیدا کیا۔ وہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کا فیضِ صحبت اور ان سے استفادہ تھا۔ اسی فیض کے نتیجہ میں آپ نے عرب کے ممتاز ادباء کے درمیان جگہ پائی۔ ڈاکٹر صاحب میں عربی زبان کی قدرت اور اسلوب بیان کی بیشتر صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ انشاء و تحریر کا جو انداز تھا وہی انکی عام گفتگو اور کلام کا بھی انداز تھا۔ نیز وہ عربی زبان و ادب اور صرف و نحو میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

اس سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

"موصوف (ڈاکٹر تقی الدین ہلالی) عالم عربی کے ممتاز ترین محقق و ادیب اور صرف و نحو میں سند و حجت کا درجہ رکھتے تھے۔ انکی بول چال اور عام تحریر کی زبان پوری عربی دنیا میں اپنی صحت سلاست، برجستگی اور عربی محاورات میں بے نظیر ہے" ص۱

چنانچہ مسعود صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی صحبت و معیت سے خوب خوب
1 استفادہ کیا۔ اور ان کی تربیت نے ہی آپ کی عربی انشاء کا ایک خاص طرز پیدا کیا۔ وہ انفرادیت اور خصوصیت پیدا کی جو شاذ و نادر ہی کسی اہل قلم میں نظر آتی ہے۔ مسعود صاحب کا نحو و صرف میں بھی ایک ممتاز مقام ہے۔ جس کی واضح مثال آپ کی کتاب "الترجمۃ العربیۃ" ہے جو آپ نے ابتدائی عربی سیکھنے والوں کے لئے مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ قدیم ماخذ ادبیہ میں کوئی ایسا ماخذ شاید ہی ہو۔ جس سے آپ نے براہ راست استفادہ نہ کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریروں میں برجستگی و سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ قدیم محاورات اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں۔ مسعود صاحب نے اپنی حیات میں عربی زبان میں بہت کچھ لکھا ہے۔ آپ نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی عربی میں کیا۔ اور "الضیاء" کی ادارت انجام دی۔ عربی میں بہت سارے مضامین لکھے۔ جو عرب ممالک کے موقر رسالوں میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم آپ کی عربی ادب میں خدمات کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

عربی ادب میں آپ کی کاوشیں

پہلا دور (۱۹۲۹ تا ۱۹۳۲م) اس زمانے میں آپ ندوۃ العلماء کے علمی و ادبی ماحول میں سید سلیمان ندوی کی سرپرستی میں عربی ادب کی تکمیل کر رہے تھے۔ اسی دور میں

ص۱ ۔ ابوالحسن علی ندوی، پرانے چراغ ص ۳۲۰

آپ کے مضامین مصری مجلہ "الزہراء" جیسے عربی کے بلند پایہ رسالوں میں چھپنے لگے۔ اس کے علاوہ عربی رسائل و مجلات جو دار المطالعہ میں آتے تھے۔ وہ آپ کے مطالعہ میں رہتے تھے۔ اس دور میں آپ کا اوڑھنا بچھونا جیسے عربی زبان و ادب ہو گیا۔ اس زمانے میں آپ نے عربی کا ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا۔ جس کا نام "القائد" تھا۔ اس کے بارے میں سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ لکھتے ہیں۔

"اس کے مضمون نگاروں کے لئے یہ شرط تھی کہ وہ اپنے مضامین خود اپنے قلم سے لکھکر شامل کریں۔ رسالہ کے ممتاز مضمون نگاروں میں ہونہار ایڈیٹر کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندویؒ، مولانا ناظم ندوی (سابق شیخ الجامعۃ العباسیہ بھاولپور) اور جوان مرگ ادیب ابو یوسف بہاری مرحوم تھے۔ اس رسالے کے شمارے ابھی تک طلبہ کی انجمن میں محفوظ ہیں۔ ان کو دیکھ کر آج بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس قلمی رسالہ کا نوعمر مدیر ایک دن ملک کا بہت بڑا ادیب اور پختہ کار صحافی بنے گا" ص۲

اسی زمانے میں عربی ادب کی تکمیل کے لئے آپ نے اہم مقالہ "تاثیر الاسلام فی الشعر العربی" کے عنوان سے لکھا۔ بعد میں یہ اہم مقالہ قسط وار "الضیاء" میں شائع ہوا۔

دوسرا دور (۱۹۳۲ تا ۱۹۳۵م) اس عرصے میں آپ نے چار سال تک عربی کا ماہوار رسالہ "الضیاء" اپنی ادارت میں بڑی محنت و لگن سے نکالا۔ اس دور میں بھی آپ کا اوڑھنا بچھونا صرف عربی ہوتا تھا۔ ان چار سالوں میں اردو کی کوئی کتاب اور رسالہ نہ دیکھا۔ ابتدائی دو سالوں میں ڈاکٹر تقی الدین ہلالی ندوہ میں موجود تھے۔ ان

ص۱ ۔ مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی عربی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ لغت پر انکی بڑی اچھی نظر تھی۔ وہ شیر بنگال مولوی فضل الحق صاحب کی دعوت پر جو اسوقت بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ مدرسہ عالیہ منتقل ہو گئے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ مدرسہ عالیہ ڈھاکہ منتقل ہو گئے۔ اور آخیر تک وہیں رہے ۱۹۷۱ء کے شروع میں ڈھاکہ میں مولانا نے انتقال کیا۔ انکے اشعار کا مجموعہ "الزہرات" ہے جس پر مولانا مسعود عالم ندوی نے مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ اور "امثال اللغتین" کے سلسلہ مضامین جس میں انہوں نے عربی اردو کے ہم معنی ضرب الامثال جمع کئے ہیں۔ ان کی علمی یادگاریں ہیں۔ غفر اللہ لہ۔ ص۲۔ پرانے چراغ۔ ص ۳۱۸

ہی کی رہنمائی اور سرپرستی میں آپ اپنے مضامین اور شذرات لکھتے۔ ان کو ڈاکٹر صاحب کو سناتے۔ وہ اصلاح بھی کرتے تھے۔ اس سے ان کے کلام میں بے حد پختگی آئی۔ اور عربی کا ایک خاص اور منفرد اسلوب پیدا ہوا۔

تیسرا دور (۱۹۳۵ تا ۱۹۴۴ء) یہ زمانہ آپ نے پٹنہ کی خدا بخش اورینٹل لائبریری میں بحیثیت کیٹلاگر گزارا۔ آپ کو مطالعہ کا کافی موقع ملتا تھا۔ عربی کے رسائل و مجلات بھی زیر مطالعہ رہتے۔ اسی زمانے میں آپ نے مصر کے مشہور صحافی محب الدین الخطیب کی خواہش پر ہندوستان کی تاریخ عربی زبان میں "تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند" کے عنوان سے لکھنا شروع کی۔ اس کا خلاصہ بعد میں "نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند وباکستان" کے نام سے مصر سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ قیام پٹنہ کے دوران آپ نے متعدد عربی اور اردو مضامین بھی لکھے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔

چوتھا دور (۱۹۴۴ سے لیکر آخری زمانہ تک کا ہے) اس زمانے میں آپ جماعت اسلامی کے رکن رہے۔ اور جماعت کے زعماء میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری کا کام آپ نے بہت کم کر دیا تھا۔ آپ جماعت اسلامی اور خاص کر مولانا مودودیؒ کی کتابوں کے ترجمے میں ہمہ تن مشغول تھے۔ جماعت اسلامی کے اہم رسالوں اور پمفلٹ کو ترجمہ کر کے آپ نے شائع کر دیا۔ اخیر زمانے میں آپ نے مصر کے عربی رسالوں "المسلمون"، "الدعوۃ" اور "الشرق" وغیرہ میں کچھ مضامین بھی لکھے۔ یہ مضامین بہت سنجیدہ لطیف اور سہل پسندی کا پہلو لیے ہوئے تھے۔ لیکن اسلوب نگارش کا مخصوص رنگ اپنی تمام خصوصیات اور امتیازی صفات کے ساتھ شروع سے لیکر آخر تک برقرار رہا۔

عربی طرز نگارش

مولانا مسعود عالم ندوی کا اسلوب بالکل سادہ تھا۔ عبارت میں کوئی حشو، نہ ترکیب

میں کوئی پیچیدگی کا گماں ہوتا ہے۔ اور معانی میں کوئی ابہام بھی نہیں تھا۔ بلکہ برجستگی اور سلاست و روانی ہوتی تھی۔ آپ عصر اول کے اسلوب و محاورات میں جدید خیالات اور جدید فکر کو بڑی خوبصورتی کیساتھ جمع کر دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ صحت زبان اور فصاحت کلام میں آب شاروں کی سی روانی اور موج دریا کا سا بہاؤ نظر آتا ہے۔ بے فائدہ جملوں، غریب اور مشکل الفاظ، پیچیدہ تراکیب اور طوالت سے آپ کا اسلوب بالکل پاک نظر آتا ہے۔ مولانا محمد کاظم سباق اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

" ان کے (مسعود عالم ندوی) اسلوب کی پہلی صفت تھی زبان کی صحت، محاورات کا صحیح استعمال، فصیح الفاظ کا انتخاب اور بلیغ تراکیب سے عبارات کی آرائش۔ زبان و محاورہ کے معاملے میں وہ تقوی کے اس اعلی مقام پر فائز تھے۔ جہاں ایک مشتبہ اور مشکوک چیز کا استعمال بھی حرام سمجھا جاتا ہے۔ جس لفظ یا ترکیب میں ذرا بھی شک ہوتا۔ اسے استعمال نہیں کرتے تھے۔ اور اس کے بجائے ایسا لفظ یا ترکیب لے آتے۔ جس کی فصاحت کا یقین ہو۔ ایک دفعہ اپنے ایک شاگرد سے کہنے لگے کہ اگر زبان دانی میں کوئی مقام حاصل کرنا ہے۔ تو یہ اصول بنا لو کہ جس لفظ و ترکیب کی صحت کا یقین کامل حاصل نہ ہو۔ اس میں ہمیشہ شک کرو۔ اور بغیر اسکی تحقیق کیے اسے کبھی استعمال نہ کرو۔ حد یہ تھی کہ جب اپنے تلامذہ کے مضامین اور ترجموں کی اصلاح بھی کرنے بیٹھتے۔ تو سب سے پہلے قاموس، اساس البلاغۃ، المصباح المنیر اور مختار الصحاح وغیرہ عربی لغت کی یہ سب کتابیں میز پر رکھوا دیتے تھے۔ اور اصلاح کرتے وقت جس لفظ میں ذرا سا بھی شک و شبہ ہوتا پاس بیٹھے ہوئے شاگرد سے کہتے کہ لغت میں دیکھو اور پڑھو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں زبان و محاورہ کی غلطیاں بہت ہی کم ہوتی تھیں۔ اور اسی کو دیکھ کر عرب کے فصحاء اور اہل زبان تعجب کرتے تھے اور انہیں اس پر خراج تحسین ادا کرتے تھے۔ اگرچہ اس ملک میں

ہندوستان) اور خود ندوہ میں انکے علاوہ اور بھی پختہ کار صاحب قلم موجود تھے۔ اور ہیں، لیکن مولانا محمد کاظم ندوی کی روایت ہے کہ الجزائر کے محمد البشیر الابراہیمی سے جب اس بارے میں ذکر آیا۔ تو انہوں نے کہا کہ مسعود الندوی افصحہم لغتہ۔ (مسعود الندوی کی زبان ان سب سے فصیح ہوتی ہے)۔

زبان و محاورہ کی صحت کے بارے میں ان کا یہ اہتمام صرف عربی ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے جاننے والوں کو معلوم ہے کہ وہ اردو اور انگریزی تک میں اس غیر معمولی اہتمام کے پابند تھے۔ انگریزی اخبار اسٹیٹسمین (STATES MAN) وہ اس لئے پابندی کیساتھ پڑھتے تھے کہ زبان کے اعتبار سے وہ اس کا معیار بہت اونچا سمجھتے تھے"۔ ؎۱

الغرض آپ کا اسلوب نہایت ہی سادہ اور دل کو موہ لینے والا ہے۔ آپ کی عربی تحریروں کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ زبان اور بلاغت کا کتنا اعلیٰ اور نازک ذوق رکھتے تھے، اس بارے میں انکی نظیر ملنا مشکل ہے۔

مولانا کی عربی ادب میں اسلامی جوش و جذبہ ہمیشہ ایک نمایاں عنصر رہا ہے۔ ہر کسی کی تحریر کو وہ پہلے اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصطفیٰ صادق الرافعی اور امیر شکیب ارسلان کو صف اول کے ادیبوں میں شمار کرتے تھے۔ اور ان دونوں کے بہت زیادہ معتقد تھے۔ ظاہر ہے کہ دینی غیرت و حمیت اور اسلامی جوش و جذبہ ان حضرات کی تحریر کا نمایاں عنصر ہے۔ اس کے برخلاف طٰہٰ حسین کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جماعت اسلامی کا تعارف کراتے ہیں تو دینی جوش و جذبہ سے بھرپور ان کا قلم رواں کیساتھ موتی بکھیرتے ہوئے چلتا ہے۔ عبارت نہایت سہل اور اسلوب نہایت ہی بلیغ ہوتا ہے۔ اور اس عبارت کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

انکے کلام کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ اسمیں ایجاز و اختصار ہوتا تھا لیکن

؎۱ ۔ چراغ راہ۔ کراچی ۱۹۵۵ء ص ۱۰۹

ساتھ ہی ساتھ عبارت واضح بھی ہوتی تھی۔ ایسا نہ تھا کہ ایجاز و اختصار کی وجہ سے بات مبہم رہ جاتی، بلکہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ "ما قل و دل" کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد کاظم سباق لکھتے ہیں۔

"وہ اس فن کا (ایجاز نگاری) بہترین نمونہ انہوں نے اپنے کتابچہ "عصروں کی قومی تحریک" میں پیش کیا ہے جسمیں انہوں نے دریا کو کوزہ میں بند کر کے رکھ دیا ہے اور ایک ایک پیرا اس شان کا لکھا ہے کہ تاریخ عرب کا پورا ایک باب اس میں سما گیا ہے ایجاز و اختصار کے اسی اصول کی طرف رہبری کرتے ہوئے راقم الحروف کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مترادفات کا آپ نے کثرت سے استعمال کیا ہے، تین تین چار چار تک آپ مترادف جملے لیتے آئے ہیں۔ یہ رنگ اس زمین کی کروٹ ہے بعض لوگ اسے پسند کرتے ہیں لیکن جو طریقہ ماثور مولانا شبلیؒ سے ہم تک پہنچا ہے وہ اس کے برخلاف ہے۔ مولانا شبلی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے۔ کہ تحریر میں جتنے ایسے جملے نظر آئیں جن کے نکالنے سے مطلب خبط نہ ہو، انہیں حذف کر دو۔ پختہ مشق لکھنے والوں کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ مختصر اور جامع لکھتے ہیں" ؎۱

الغرض مولانا کا ایک خاص اسلوب تھا جس میں فصیح و بلیغ استعاروں اور شستہ و شگفتہ لفظوں کا انتخاب ہوتا تھا، عربی ضرب الامثال اور ترکیبوں کی بندش ہوتی تھی، الفاظ کا حسن انتخاب اور قرآن کریم کی آیات سے استفادہ ہوتا تھا، سلاست و روانی اور وضاحت و صفائی ہوتی تھی۔

ایک کامیاب مترجم

مسعود عالم ندویؒ ایک کامیاب مترجم بھی تھے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

؎۱ ۔ چراغ راہ کراچی ۱۹۵۵ء ص ۱۷۹

کی کتابوں کا ترجمہ اس انداز سے کیا ہے کہ ترجمہ کا گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کا اکثر لٹریچر آپ ہی کی زیرِ نگرانی عربی میں ترجمہ ہوا ہے اور اسی کے ذریعہ سے عالمِ عرب جماعت کی دعوت سے متعارف ہوا ہے، یہ ایک ایسا اہم کارنامہ ہے جسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا، چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

"جماعت اسلامی کے پاس اردو کے بڑے اچھے نقّاد اور افسانہ نویس تھے، لیکن کوئی ایسا عربی کا ادیب اور صاحبِ قلم نہ تھا، جو اس کی دعوت کو ممالکِ عربیہ میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتا، مسعود صاحب کی ذات میں اس کو عربی میں دعوت کا ایک کامیاب ترجمان اور ممالکِ عربیہ کے لئے ایک فاضل سفیر مل گیا، ح۱

اور یہ حقیقت ہے کہ مسعود صاحب کی شکل میں تحریکِ اسلامی کو ممالکِ عربیہ کے لئے ایک کامیاب ترجمان مل گیا تھا، اور جماعتِ اسلامی کی دعوت کو جس انداز میں مسعود صاحب نے ممالکِ عربیہ تک پہنچایا، وہ انہی کا حصہ ہے،

مولانا عبداللہ عباس ندوی لکھتے ہیں۔

"...... مولانا مسعود عالم ندوی ایک کامیاب اور فاضل مترجم بھی تھے، سید صاحب کے متعدد مضامین مثلاً عربوں کی جہاز رانی، عرب و ہند کے تعلقات، کا مولانا نے اتنا شستہ ترجمہ کیا ہے کہ متن کی بلاغت سے ترجمہ کی بلاغت کم نہیں ہے، روانی اور برجستگی کا حال یہ ہے کہ گویا مستقل تصنیف ہے، لیکن پابندی اس قدر کہ استاد کا کوئی لفظ چھوٹنے نہیں پایا ہے، مولانا کے ابتدائی تراجم اور اُن کے انشاء میں فرق کرنا بہت دشوار ہے، لیکن بعد کے ترجموں میں حقیقت پسندی زیادہ نمایاں ہے، اسی وجہ سے عبارت کی شگفتگی میں کمی آگئی تھی اور "الضیاء" کے دور میں جو مولانا کے قلم میں جولانی تھی، وہ شاید امتدادِ زمانہ اور ضعفِ صحت کے باعث کم ہوگئی تھی یا ممکن

ح۱ :- ماہنامہ الفرقان ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ ص۴۱

ہے کہ دینی فکر کے غلبے نے ان ادبی گل بوٹوں کی اہمیت ان کی نگاہ میں کم کر دی تھی، لیکن یہ قدرے ذرا ایک بات ہے، جس کا اندازہ کرتے میں مختلف رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن جس امر میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں، وہ یہ ہے کہ مولانا مسعود عالم ندوی ہند و پاک میں سوائے ایک (مولانا ابوالحسن علی ندوی) کے اپنی دوسری نظیر نہیں رکھتے تھے، اور انشاپردازی میں وہ عرب ادباء سے کسی درجہ کم نہیں تھے، اس کا اعتراف خود ان کے استاد شیخ تقی الدین الہلالی کو بھی تھا، اور مصر و شام کے علمی حلقوں میں یہ بات تسلیم شدہ ہے ح۱

جیسا کہ مولانا تقی الدین ہلالی لکھتے ہیں۔

"۱۳۶۹ھ میں جب میں کوشش کر کے عراق واپس پہنچا، تو مسعود صاحب نے مولانا مودودی کے جن رسالوں کا ترجمہ کیا تھا، ان کا ایک ایک نسخہ مجھے روانہ کیا، میں نے ان رسالوں کی زبان دیکھی، تو نہایت شستہ اور ہر قسم کی کمزوریوں اور غلطیوں سے صاف تھی، مادی اور روحانی استعمار کے اس زمانے میں عرب مصنفین اور ادباء کے قلموں پر جو غلط ترکیبیں رائج ہوگئی ہیں، ان رسالوں کی زبان ان سے پاک تھی، ح۲

اسی طرح عرب دنیا کے سب سے بڑے ادیب علامہ محمد البشیر الابراہیمی نے دار العروبہ کے عربی میں ترجمہ شدہ رسالوں کی بابت لکھا۔

"میں نے ان رسالوں کے اندر الفاظ و معانی میں ایسی مناسبت اور ہم آہنگی پائی ہے کہ بالکل محسوس نہیں ہوتا، کہ یہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کئے گئے ہیں، اور اس کا راز یہ ہے کہ موضوع بھی اسلامی ہیں اور دونوں زبانیں بھی اسلامی ہیں نیز مولف اور مترجم دونوں ایک ہی فکر (فکرِ قرآن) کے پروردہ ہیں، اس لئے اس ترجمہ میں دونوں نے اپنی کارفرمائی دکھائی ہے۔ ہمارے دوست مسعود صاحب ـــــ اللہ کا لطف ان کے شاملِ حال ہو، ح۳

ح۱ :- چراغ راہ - ص۱۲
ح۲ :- ایضاً - ص۱۴
ح۳ :- ،، ص۱۲۳

الضیاء۔ (ندوۃ العلماء کا علمی و ادبی ترجمان)

"الضیاء" دار العلوم ندوۃ العلماء کا بھی وہ علمی و دینی اور عربی مجلہ تھا، جس کی آواز نے عربوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، مولانا مسعود عالم ندوی اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر تقی الدین ہلالی اور مولانا سید سلیمان ندوی اس رسالہ کے سرپرست تھے۔"

محرم ۱۳۵۱ھ (مئی ۱۹۳۲ء) سے اس عربی ماہنامے کا آغاز ہوا، رسالہ اگرچہ پتھر پر چھپتا تھا، لیکن زبان کی صحت، حسن انشاء اور مضامین کی بلندی کی وجہ سے عربی ممالک کے علمی و ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوا، لیکن چار سال کے بعد عرب ممالک تک ہندوستان کے حالات اور دینی و علمی مضامین کا پہنچانے والا یہ واحد عربی رسالہ خود ارباب ندوۃ کی نگاہ عتاب کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا، اگرچہ مسعود صاحب نے بذات خود اس رسالہ کو جاری رکھنے کی مسلسل کوشش کی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء کو علامہ سید سلیمان ندوی مسعود صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"الضیاء کی تعویق سے تکلیف ہے، اب نئے سال سے ہمت کرو، اللہ مددگار ہے
ان تنصروا اللہ ینصرکم۔"

اس خط پر مسعود صاحب کا نوٹ یوں لکھا ہوا ہے۔

"الضیاء بھی استاد ممدوح کی علالت کے زمانے میں ارباب ندوۃ کی نگاہ عتاب کا شکار ہو گیا، سید صاحب قبلہ علیل تھے، مالی امداد مل نہ سکی، اہل ندوہ نے رائے قائم کی کہ اس کی بجائے مدیر "الضیاء" کی شوخیاں اسی رسالے کے بل پر ہیں، کیوں نہ اسے مرنے دیا جائے؟ ان دانشمندوں کو یہ خیال نہ آیا کہ ذاتی پرخاش میں وہ اپنا ارگن خود ہی ختم کر رہے ہیں، وہ چاہتے تو مجھے الگ کر کے کسی دوسرے کو ایڈیٹر بنا سکتے تھے۔"

۱:۔ مکاتیب سلیمان مکتبہ چراغ راہ کراچی ۱۹۵۲ء ص ۲۱

یہ رسالہ بیاضی تقطیع کے چالیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، اس میں ایڈیٹر کے علاوہ نمایاں اور مستقل لکھنے والوں میں سے چند کے نام اس طرح ہیں، شیخ تقی الدین ہلالی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی وغیرہ اس رسالے میں علمی، دینی، تعلیمی، تاریخی اور دیگر مسائل پر تحقیقی مقالات ہوا کرتے تھے، خالص ادبی مضامین کا بھی ایک سلسلہ ہوتا تھا، اور "خیر الحوادث"، "اخبار و آثار" اور "نظرات" کے عنوان سے عالم اسلام کے واقعات پر تبصرہ خود ایڈیٹر کے قلم سے ہوتا تھا، مولانا مسعود صاحب رسالہ کو خود ترتیب دیتے، مضامین کی نوک پلک درست کرتے، لوگوں سے مضامین طلب کرتے، باہر سے آنے والے تمام خطوں کا جواب دیتے، خود ہی حساب کتاب رکھتے، خود ہی تمام پرچوں پر پتے لکھ کر روانہ کرتے، باہر سے جو عربی پرچے آتے، ان سب کو پورے اہتمام سے پڑھتے، اور جہاں کسی مضمون کی تردید کرنا ضروری سمجھتے، اس رسالہ میں اس کی تردید بھی خود ہی کرتے، گویا کہ "الضیاء" کا پورا بار آپ ہی کے کندھوں پر تھا، لیکن اس کے باوجود یہ رسالہ چار سال تک پوری آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا، اور عرب ادباء اس کو پڑھ کر جھومتے تھے، انہوں نے دل کھول کر اس رسالہ اور اس کے جواں سال مدیر کی حوصلہ افزائی کی، حیرت و مسرت کے ساتھ اس رسالہ کا زبردست استقبال کیا، تمام ادبی رسالوں نے اس پر تبصرے شائع کئے، اور ان کو حیرت اس بات پر تھی کہ ہندوستان سے نکلنے والے اس عربی رسالے کی زبان عرب ممالک سے نکلنے والے رسالوں سے کہیں زیادہ معیاری تھی چنانچہ المجمع العربی دمشق نے "جو عربی ممالک میں ایک اہم علمی و ادبی اکادمی ہے" نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

(ترجمہ) تونس، جزائر اور مراکش میں عربی زبان کا نشو و نما کوئی تعجب کی بات نہیں، تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ غیر عرب ممالک میں اس زبان کی روشنی پھیل رہی ہے اور وہاں اس کا جھنڈا لہرا رہا ہے، جیسا کہ آج ہندوستان میں صاحب فن اساتذہ

کے لفظ سے اسماعیل پاشا کی ترقی ہو رہی ہے، انہوں نے ایک علمی، ادبی، تعلیمی اور اجتماعی رسالہ کی داغ بیل ڈالی ہے، اور اس رسالہ کی زبان اپنی فصاحت و بلاغت اور واضح عربیت میں مصر کے موجودہ عہد کی زبان ہے، اس رسالہ کے جاری کرنے والے، استاد مسعود عالم ندوی ہیں" (الضیاء شوال ۱۳۵۰ھ)

اسی طرح سے عالم عرب کے متعدد ادبا نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، اس زمانے میں بغداد (عراق) سے ایک عیسائی ادیب "الاب انستاس الکرملی" کی زیر ادارت ایک رسالہ "لغۃ العرب" کے نام سے نکلتا تھا، موصوف نے اپنے ایک خط میں مسعود صاحب کو علامہ کے لفظ سے خطاب کیا ہے۔

اگرچہ آپ نوعمر ہیں، لیکن آپ کے علمی تبحر کی وجہ سے میں آپ کو علامہ کے لقب سے نواز رہا ہوں، اور میری رائے کے مطابق آپ کا رسالہ عربی ادب میں ایک بہت بڑے خلا کو پُر کر رہا ہے، اور جلد ہی آپ اپنی کوششوں میں کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ (الضیاء شوال ۱۳۵۰ھ)

اس رسالہ نے بہت جلد عرب ادبا کی نظروں میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا، مسعود صاحب کا نام بھی پورے عالم عرب میں گونجنے لگا، ہر طرف سے مبارکباد اور تحسین کے خطوط آتے رہے، مصر، الجزائر، تونس اور مراکش کے ادیبوں نے دل کھول کر داد دی، یہاں تک کہ عربی کے چوٹی کے اہل علم امین نامرالجنی نے جو محقق اور لغوی بھی تھے "اس رسالہ کے بارے میں یوں لکھا:۔

عربوں کے لئے مقام غیرت ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر رسالوں سے اس عجمی ملک کے رسالے کی زبان بہتر و برتر ہوتی ہے۔

رب کعبہ کی قسم۔ یہ کیسے تعجب کا مقام ہے کہ کتاب الٰہی کی زبان اپنے وطن سے زیادہ ایک عجمی ملک میں پُر شوکت اور با وقار ہوا[1]

---

[1]۔ چراغ راہ ص ۱۲۳

عالم اسلام کے مشہور ادبا اور علما سے "الضیاء" اور مسعود صاحب کے گہرے روابط تھے، اور ان مراسم و روابط کی کڑی بھی "الضیاء" تھا، یہی وجہ ہے کہ اکثر رسالوں میں امیر شکیب ارسلان، سید رشید رضا اور دوسرے ادبا و اہل قلم کے مراسلات چھپے ہیں، جن میں عرب ممالک کے ادیبوں کی زبان، انداز بیان اور ان کے فکر کے فساد پر انہیں آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے، اور انہیں "الضیاء" کی مثال دے کر شرم دلائی گئی ہے۔

ڈاکٹر تقی الدین ہلالی لکھتے ہیں۔

"یہ رسالہ عربی کے تمام رسائل و اخبارات کے نزدیک حد درجہ مقبول ہوا، اکثر پرچے اس کے مضامین اپنے صفحات میں نقل کرنے لگے، جس سے تمام عربی ممالک میں مسعود عالم صاحب کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، اور عالم اسلام کے تمام ادبا اور علما ان کے علم و ادب کا اعتراف کرنے لگے، یہ وہ چیز ہے جو ہندوستان بجز کے کسی دوسرے ادیب اور عالم کو اس عمر میں نصیب نہیں ہوئی[1]

"مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو اس رسالے کے مستقل لکھنے والوں میں سے ایک تھے" اس رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"رسالہ (الضیاء) کے مضمون نگار اگرچہ بہت محدود تھے، اور پرچہ چھوٹے پریس میں چھپتا تھا، جو عرب قارئین کے مذاق طبیعت کے بہت خلاف اور ان کی نگاہوں پر بار ہوتا ہے، لیکن زبان کی صحت، حسن انشاء اور مضامین کی بلندی کی وجہ سے وہ ممالک عربیہ کے سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا، اور اس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا، اور موقر و فصیح رسائل و مجلات نے دل کھول کر داد دی، لبنان کے امیر ناصر الدین نے جو اپنی ادبی تنقید اور ادبی ذکاوت جس میں بذاتہٖ کی حد تک نامور تھے" اپنے اخبار "الضیاء" میں بڑے بلند کلمات کے ساتھ تبصرہ کیا، غالباً اسی میں تھا، کہ یہ ہندی رسالہ اپنی صحت زبان اور عربیت میں خود ممالک عربیہ کے بہت

---

[1]۔ چراغ راہ ص ۱۲۰

سے رسالوں پر فوقیت رکھتا ہے، اسی طرح "صیدا" شام کے مشہور ادبی رسالہ "العرفان" نے بڑا زوردار تبصرہ کیا ....

.... اس رسالہ میں علاوہ ادبی مضامین کے عالم اسلام کی اہم خبریں اور ہندوستان کے سیاسی حالات پر تبصرہ اور تنقیص بھی ہوتی تھی، مسعود صاحب یہ حصہ بھی پوری روانی اور بے تکلفی سے لکھتے تھے، وہ عموماً مضامین قلم برداشتہ لکھتے تھے، اور اپنے مسودہ میں بے تکلف اصلاح کرتے، میں بھی ایک طرح سے رسالہ کا ایک مستقل مضمون نگار ہونے کی وجہ سے شریک ادارت تھا، اور بہت غور و فکر کے ساتھ بنا سنوار کر لکھنے کا عادی تھا، جو مضامین جلد دینے کے ہوتے تھے یا ادارتی اور صحافتی قسم کے ہوتے، وہ مسعود صاحب خود ہی لکھتے، جس مضمون کو بہت اہتمام سے لکھنا ہوتا، وہ اکثر میرے سپرد کرتے، اور کہتے تھے کہ میں تو پیشہ ور لکھنے والا (Professional) ہوں، اس سرعت کے باوجود ان کے ہر مقالے میں ادبی چاشنی اور زبان کا لطف ہوتا تھا،" (پرانے چراغ ص ۳۲۱)

بقیہ: اسلام کے دشمن ....

(۱۳) عبد یالیل ثقفی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف تبلیغ اسلام کے لیے تشریف لے گئے تو اس نے لڑکوں، غلاموں اور اوباشوں کو حضور پر پتھر، کیچڑ پھینکنے کے لئے مقرر کیا تھا لیکن چند سال کے بعد یہ خود (دو سرے پانچ سرداروں کے ساتھ) مدینہ میں حاضر ہوتے، ایمان لاتے اور اپنی قوم میں مبلغ بن کر جاتے ہیں اور تمام قبیلہ ایک دن میں مسلمان ہو جاتا ہے۔

(۱۴) بریدہ بن الحصیب اسلمی۔ کفار قریش کی طرف سے سو اونٹ انعام کی خبر پاتے اور ستر سوار ساتھ لیکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ پکڑ لانے یا ہلاک کرنے کا عزم لے کر گھر سے روانہ ہو جاتے ہیں کہ جب ان کی نظر حضورؐ کے چہرۂ پرنور پر پڑتی ہے اور کان میں آواز حق آتی ہے تو اپنی پگڑی کو اپنے نیزے پر باندھ کر حضورؐ کے نشان بردار بن جاتے ہیں۔ اور غلامانہ ہمرکاب ہو کر آگے آگے چلتے ہیں۔

نوٹ:۔ یہ واقعات بعض نقلی ترمیموں کے ساتھ رحمۃ للعالمین جلد دوم سے لئے گئے ہیں۔

عبدالبرّ اثری فلاحی

تعارف و تبصرہ

نام: آموزگار (ماہنامہ) خصوصی اشاعت: یوپی تعلیمی کارواں نمبر (۱)
جلد نمبر ۱۲ شمارہ نمبر ۱ جنوری ۱۹۹۳ء

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر اکبر رحمانی

ضخامت: ۵۸ صفحات

قیمت: ۱۵ روپے

پتہ: ماہنامہ آموزگار کاشانہ سہیل، ۳۰ بھوانی پیٹھ، اسلام پورہ، جلگاؤں، مہاراشٹر

یہ رسالہ اردو پرائمری، سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری ٹیچروں کا ترجمان ہے میرے علم کی حد تک ہندوستان میں شائع ہونے والے تمام رسائل و جرائد میں یہ واحد رسالہ ہے جو خالص تعلیمی موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے، گویا یہ اس کا امتیازی وصف ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ مدیر اعلیٰ ڈاکٹر اکبر رحمانی صاحب اور ان کے رفقاء کار قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے تعلیم جیسے اہم پہلو کو اپنا خصوصی محور بنایا اور اسی میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں، کیونکہ بغیر تعلیم کے نہ کوئی انقلاب آتا ہے اور نہ کوئی ملت پستی سے نکل پاتی ہے، چنانچہ ملت کی موجودہ زبوں حالی کا واحد علاج تعلیم ہی ہے جیسا کہ علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے کہا تھا ؎

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
ہے خون فاسد کیلئے تعلیم مثل نیشتر

اس خصوصی تناظر میں دیکھا جائے تو میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ ملت کے ہر فرد کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔

زیر تبصرہ شمارہ رابطہ کمیٹی یوپی (جو مسلمانوں کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے) کی جانب سے نکالے گئے تعلیمی کارواں کے علی گڑھ سے دیوبند

[illegible] ہے، یہ ادارہ گذشتہ سال تعلیمی سروے اور تعلیمی بیداری [illegible] کیلئے نکالا گیا تھا۔ جہاں تک بیداری کا تعلق ہے یہ تو مستقبل بتائے گا البتہ جو سروے سامنے آیا ہے۔ اس سے بہت سی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں آئندہ جو لوگ بھی اس میدان میں کام کرنا چاہتے ہوں انہیں اس سے ضرور استفادہ کرنا چاہیئے۔

اس کے بعض مندرجات محل نظر ہیں لہٰذا اسکا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) محترم مدیر اعلیٰ نے جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب سے بابری مسجد وغیرہ کے موضوع پر اپنی ایک گفتگو کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"میں نے پوچھا: اگر یہ مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی جائے تو کیا وہاں نماز ادا کی جا سکے گی؟ سیٹھ صاحب نے کہا: جب تک وہاں رام للاّ کی پوجا جاری ہے، نماز ادا کرنا ممکن نہیں۔ (ص۲۳)

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ مجھے محترم سیٹھ صاحب کے "فتویٰ" سے اتفاق نہیں۔ پتہ نہیں کس دلیل کی بنیاد پر انہوں نے ایسا کہا ہے۔ میں تو سیرت نبویؐ کے مطالعہ سے یہ جانتا ہوں کہ آپؐ کی زندگی میں خانہ کعبہ کے اندر بت کی موجودگی میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔

(۲) ص۔ پر "علم سے مراد" کے ذیلی عنوان کے تحت محترم مدیر رقمطراز ہیں "اب تک ہمارے علمائے کرام مسلمانوں کو یہی بتاتے رہے کہ حضورؐ نے جس علم کا حاصل کرنا مسلمان مرد و عورت پر فرض قرار دیا ہے وہ "علم دین" ہی ہے۔ اسلام جو کہ دین اور دنیا میں تفریق کا قائل نہیں اور جس نے سیاست کو بھی دین ہی کا جزو قرار دیا۔ اسلام نے ترک دنیا اور رہبانیت کی کبھی تعلیم نہیں دی، لیکن ہمارے علماء حضرات نے علم کے معاملے میں دین اور دنیا کی تفریق کر کے ایک عرصے تک مسلمانوں کو عصری علوم سیکھنے سے روکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اپنی ہمسایہ قوموں سے تعلیم میں کافی پچھڑ گئے"

علمائے کرام پر عصری علوم سیکھنے سے روکنے کا الزام بہت پرانا ہے۔ لیکن جس طرح عام لوگ بلا دلیل یہ بات کہتے ہیں ویسے ہی محترم مدیر اعلیٰ نے بھی لکھ ڈالی۔ حالانکہ یہ بات

سراسر غلط ہے۔ اگر ان کے پاس کسی مستند عالم کا مستند قول ہے تو پیش کریں۔ ممنون ہوں گا۔ ورنہ اس قسم کی باتوں سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خطبہ افتتاحیہ کے موقع سے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا اسے پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں۔ وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا" (بر حاشیہ موج کوثر از شیخ محمد اکرام ص۹۰)

(۳) اس رسالے کو پڑھنے سے ایک تاثر یہ ملا کہ محترم مدیر اعلیٰ اردو کی زبوں حالی سے بہت زیادہ دل گرفتہ ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں بھی لیکن اس کے باوجود اردو کے بجائے ہندی ہی الفاظ کو استعمال کرنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مثلاً ص۵۳ پر امیر خسرو کی جنم بھومی ــــ پٹیالی" ذیلی عنوان باندھا ہے۔ کیا جنم بھومی کے بجائے "جائے پیدائش" کا لفظ نہیں استعمال کیا جا سکتا تھا؟

(۴) ص۶۲ پر "مسلم یونیورسٹی کو اردو یونیورسٹی بنایا جائے" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔ "اب تو انگریزی کے بجائے دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا رجحان ہمارے ملک میں بڑھتا جا رہا ہے کیوں نہ مسلم یونیورسٹی کو بھی اردو ذریعہ تعلیم کی ایک مرکزی یونیورسٹی بنایا جائے۔ حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں نہایت کامیابی کے ساتھ یہ تجربہ کیا جا چکا ہے اردو اعلیٰ تعلیم کی منزلوں کا ذریعہ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ سر سید نے اردو زبان و ادب میں جو انقلاب لایا اس کا مقصد یہی تھا کہ اردو کو ایک علمی زبان بنایا جائے تاکہ وہ فلسفیانہ علمی اور سائنسی خیالات کے اظہار کرنے کے قابل ہو جائے انہوں نے ایک اردو یونیورسٹی ہی کا خواب دیکھا تھا کیا علی گڑھ کے علماء و فضلاء اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں گے؟"

یہ تجویز اپنی جگہ نہایت عمدہ ہے۔ اور میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں۔ کاش ایسا

ہو جاتا۔ لیکن اس کے اندر یہ جملہ "انہوں (سرسید) نے ایک اردو یونیورسٹی ہی کا خواب دیکھا تھا" دلیل کا محتاج ہے، کیا محترم مدیر اسے فراہم کر سکتے ہیں۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کے کتابت و طباعت کا معیار عمدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ کتابت کی بعض غلطیاں خود اس شمارے میں بھی ہیں کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
ٹائیٹل کا اندرون	۶	ہم	علم
۱۱	۵	مقتدا	مقتدی
۱۹	۱۲	وضعی	وضع
۲۳	۳	کاموں	کارواں

بقیہ: خلافت ارضی ......

ندویؒ کے چند جملے پر جا کر رک جاتی ہے۔ یہاں اس کو نقل کرنے پر اکتفا کروں گا۔ جن کا تذکرہ موصوف نے سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کی ظاہری ناکامی کے ضمن میں کیا ہے؛

"...... آج کفر کے حملے کسی ایک مورچے پر محدود نہیں۔ ہر آنے والی سانس کفر کے جراثیم سینوں میں داخل کر رہی ہے۔ فضا آلودہ اور زہریلی گیسوں سے مسموم ہے اس کے مقابلہ کے لئے مکمل اور ہمہ جہتی پروگرام کی ضرورت ہے۔ نمرود کی آگ آج ہر کوچہ و بازار میں بھڑک رہی ہے، لیکن اولاد ابراہیمؑ کو شاید اس کی خبر بھی نہیں طاغوتی طاقتوں کا پرچم کوہ و دشت، ویرانہ اور آبادی، ہر جگہ لہرا رہا ہے۔ کون ہے اللہ کا بندہ جو بڑھ کر حق اور ایمان باللہ کا علم بلند کر دے؟" (ہندوستان کی پہلی تحریک اسلامی ص ۱۵۲)

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک　　ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

اسلام کے دشمن جو اسلام کے دوست ہو گئے

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اسکی دعوت ہر انسانی فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ اسلام کی مخالفت اور اس سے دشمنی کی وجہ عموماً یہ ہوتی ہے کہ انسان کی فطرت پر پردے پڑ جاتے ہیں لیکن ان پردوں کے اٹھتے ہی وہ اسلام اور مسلمانوں کا دوست بن جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسلام کے داعیوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ مخالفوں اور دشمنوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دیں تاکہ انکی بھلائی اور خیر خواہی ان پردوں کو ہٹانے اور اٹھانے میں مددگار ثابت ہو۔ ساتھ ہی اس نے یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ ایسا کرنے سے دشمن قریبی دوست بن جائیں گے۔ سورہ حم السجدہ میں کہا گیا ہے کہ؛

اور نیکی و بدی برابر نہیں ہیں، مخالفت کو ایسے طریقے سے دفع کرو جو سب سے بہتر ہو اس طرح وہ شخص کہ جس سے تمہاری دشمنی ہے تمہارا قریبی دوست بن جائے گا۔ (آیت ۳۴)

یہی بات سورۃ الممتحنہ میں بایں اسلوب ارشاد فرمائی گئی ہے۔

عنقریب ہے اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اور تمہارے دشمنوں کے درمیان مودت پیدا کر دے گا اور اللہ قادر ہے اور اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے (آیت ۷)

ہر زمانے میں قرآن کی یہ پیشین گوئی اور خوشخبری پوری ہوتی رہی ہے اور تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں ذیل میں عہد رسالت کے چند واقعات پیش کئے جا رہے ہیں۔ متعدد واقعات میں مخالفوں کے اثر پذیری اور حسن سلوک میں خود قرآن کی تاثیر بھی شامل ہو گئی ہے۔

(۱) عمرؓ جیسے شخص جنہیں آج بھی یورپ جنرل عمر کے نام سے یاد کرتا ہے۔ گھر سے مسلح ہو کر نکلے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کر دیں لیکن قرآن کی چند آیات سن کر شمشیر ان کے ہاتھ سے

گرچکی ہے اور اپنی ہمشیرہ فاطمہ رضی کے گھر سے متواضع بن کر سرورِ کائنات کے حضور میں حاضر ہو جاتے ہیں اور پھر فاروقؓ کے خطاب سے عزت پاتے ہیں۔ رضی اللہ عنہ۔ حضرت عمرؓ کی اثر پذیری میں ان کی بہن کے اخلاق، ان کی نرمی اور حسن سلوک کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) ثمامہ بن اثال کے نزدیک حضورؐ سے بڑھ کر کوئی شخص اور مدینۃ النبی سے بڑھ کر کوئی جگہ قابل نفرت نہ تھی وہ نجد کے رئیس تھے وہ مدینہ میں صرف تین دن قید رہے اور جب ان کو بلا کسی شرط کے آزاد کیا گیا تو اسی روز مسلمان اور بعد ازاں حضور کے فریفتہ و شیدا ہو گئے۔ قید کیا ہوئے کہ محبت کے صید بن گئے۔

(۳) سعد بن زرارہ مدینہ کے مشہور سردار گھر سے مسلح ہو کر نکلتے ہیں کہ اسلام کے مبلغ اول مصعب بن عمیرؓ کو آبادی شہر سے باہر نکال دیں لیکن حضرت مصعب کا اخلاق انہیں اپنے پاس بٹھا لیتا ہے۔ وہ چند آیتیں سنتے ہیں اور ان کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر کے اٹھتے ہیں

(۴) خالد بن عقبہؓ قرآن سنتے ہیں تو ششدر رہ جاتے ہیں اور جب چونک کر سنبھلتے ہیں تو بول اٹھتے ہیں۔ خدا اس میں عجیب شیرینی ہے ___ اس میں عجیب تر و تازگی ہے۔ اس کی جڑیں سیراب ہیں اور اس کی شاخیں پھل سے لدی ہوئی ہیں ___ بشر تو ایسا کہہ ہی نہیں سکتا"

(۵) ذوالبجادین رضی اللہ عنہ راعی تھے۔ آتے جاتے مسلمان مسافروں سے آیات قرآنی یاد کیا کرتے، آخر کار گھر بار، خویش و اقارب، مال و مویشی اور چچا اور ماں سب کو چھوڑ کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

(۶) عبداللہ بن ابو امیہ بن مغیرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے، مگر اسلام کے ایسے مخالف کہ حضورؐ سے انہوں نے علانیہ کہہ دیا تھا کہ اے محمد! اگر تو زینہ لگا کر آسمان پر بھی چڑھ جائے اور میری آنکھوں کے سامنے آسمان سے اترے۔ تیرے ساتھ چار فرشتے بھی ہوں اور وہ تیری نبوت و صداقت کی شہادت بھی دیں تب بھی میں ایمان نہیں لاؤں گا۔

یہی عبداللہ بہ توفیق ربانی شرف نبوت میں حاضر دربار ہوتے اور اقرار شہادتین سے معراج ایمان پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اہل خبر و نظر اندازہ کریں کہ عبداللہ نے وہ کچھ دیکھا جو آسمان

پر زینہ لگا کر چڑھنے اور اترنے اور فرشتوں کی شہادت دینے سے بھی بڑھ کر تھا۔

(۷) عمرو بن العاص اسلام کی مخالفت میں اتنے چالاک تھے کہ قریش نے دربار نجاشی میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا تاکہ حبش میں پناہ گزیں مہاجروں کو مجرموں کی طرح حاصل کر کے واپس لائیں وہی چند سال بعد گردن جھکائے حیا سے آنکھوں کو قدموں پر جمائے حاضر ہوتے ہیں۔ پھر وہی مبلغ اسلام بن کر جاتے اور ملک عمان کے داخل اسلام ہونے کی بشارت لے کر دربار رسولؐ میں حاضر ہوتے ہیں اور پھر وہی مصر کے فاتح اول بنتے ہیں۔

(۸) ابو سفیان صخر بن حرب نے احد غزوہ سویق و احزاب وغیرہ میں مسلمانوں پر حملے کئے۔ بھاری فوجیں لائے مگر وہی اسلام میں داخل ہو کر فتنہ ارتداد میں ثابت قدم رہ کر فتوحات شام وغیرہ میں نہایت کار گزار ثابت ہوئے۔

(۹) ابو سفیان بن حارث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی تھے، شاعر زبان آور، شروع شروع میں اسلام اور مسلمانوں کی ہجو میں شعر کہا کرتے۔ پھر بہ توفیق ایزدی حاضر ہوتے ہیں اور ابو سفیان سید فتیان اہل الجنۃ کے خطاب سے مشرف ہوتے ہیں۔

(۱۰) سہیل بن عمروؓ صلح حدیبیہ میں بھی کفار کی طرف سے معاہدہ کے کمشنر تھے۔ جب اسلام میں داخل ہوئے تو انہیں کے خطبہ نے بعد از وفات نبویؐ اہل مکہ کو استقامت و استقلال بخشا اور بالآخر شہید ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

(۱۱) عکرمہ بن ابوجہل شروع شروع میں اسلام کی مخالفت میں باپ سے بھی آگے تھے لیکن جب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ آپ کے جان نثار اور عاشق زار بن گئے۔ فتوحات میں خالد بن ولید کے بھی دست و بازو ہوتے اور دو ہزار کفار پر اکیلے بھاری دیکھے جاتے۔

(۱۲) حکیم بن حزام قرشی اسدی نے ۶۰ سال کفر میں پورے کئے۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے خلاف بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ پھر اسلام لائے اور ۶۰ سال اسلام کی خدمت میں پورے کئے۔ ایک حج کے موقع پر ایک سو اونٹ اور ایک ہزار بکرے قربان کئے اور ایک سو غلام آزاد کئے

الفقیہ، ۵۲

ابن انعام علاقی

اخبار علمیہ

قرآن وحدیث کا پہلا اردو کمپیوٹر پروگرام

حیدرآباد (فانا) پاکستانی کمپیوٹر انجینئر محمد انعام علوی نے قرآن وحدیث کا پہلا اردو کمپیوٹر پروگرام تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے "نور الہدیٰ" کے نام سے تیار کئے گئے اس ڈاٹا بیس (DATA BASE) پروگرام میں قرآن مجید کا اردو اور انگریزی ترجمہ اور احادیث کی چھ کتابوں (صحاح ستہ) کے اردو تراجم کو محفوظ کیا ہے ان تراجم سے استفادہ کو سہل بنانے کی غرض سے انہیں ۲۰۰ موضوعات اور ۴۰۰ عناوین میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مسٹر علوی نے یہ پروگرام حیدرآباد دکن کی ایک کمپیوٹر کمپنی کے اشتراک سے تیار کیا ہے۔ جو پچھلے ایک سال سے اس منصوبہ پر کام کررہے تھے امید ہے کہ نومبر میں یہ پروگرام صارفین کیلئے دستیاب ہوگا۔

پروگرام میں ہر سورہ کی تفصیل اور زمانہ نزول اور احادیث کے پروگرام میں راویوں کا تذکرہ شامل ہے۔ نورالہدیٰ میں یہ سہولت بھی شامل ہے کہ آپ اپنی پسندیدہ تفسیر اس میں محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اسکی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی متن پہلی بار اعراب کے ساتھ لکھا گیا ہے جو عرب دنیا میں موجود پروگراموں میں اس طرح کی سہولت نہیں ہے۔

(سہ روزہ دعوت نئی دہلی ۲۵ رجولائی ۱۹۹۳ء ص ۲)

بنگلہ دیش میں خواتین یونیورسٹی

ڈھاکہ (فانا) بنگلہ دیش میں خواتین کے لئے ایک مکمل خود مختار یونیورسٹی کے قیام کا ایک رضاکار انجمن نے بیڑہ اٹھایا ہے۔ یہ یونیورسٹی جو دارالحکومت ڈھاکہ میں تعمیر کی جارہی ہے کو "سنٹرل ویمن یونیورسٹی" کا نام دیا گیا ہے۔ مرکزی انجمن برائے خواتین کی کنوینر محترمہ سیدہ ربعہ زمان

نے بتایا کہ یونیورسٹی اعلیٰ تعلیمی معیار اور ڈسپلن پر بھرپور توجہ دے گی تاکہ بنگلہ دیشی خواتین کی علمی اور اخلاقی نشوونما کے لئے صحیح ماحول پیدا کیا جاسکے۔

(سہ روزہ دعوت نئی دہلی ۲۵ - ۲۸ جولائی ۱۹۹۳ء ص ۲)

اسلامی ملکوں میں شرح خواندگی

اس وقت دنیا میں تقریباً ۸۵ کروڑ افراد ناخواندہ ہیں۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں چھ افراد میں سے ایک ان پڑھ ہے۔ ایک عالمی سروے کے مطابق دنیا میں ناخواندہ افراد کی سب سے زیادہ تعداد براعظم ایشیا اور براعظم افریقہ کے ملکوں میں ہے، بیشتر اسلامی ممالک انہی دو براعظموں میں واقع ہیں۔ اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے بڑی ندامت محسوس ہورہی ہے کہ دنیا میں کوئی قوم تعلیمی لحاظ سے سب سے زیادہ پسماندہ ہے تو وہ مسلمان ہیں۔

دنیا میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کس قدر خراب وخستہ ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد وشمار سے بآسانی کیا جاسکتا ہے یہ اعداد وشمار (COMPETITION SUCCESS YEAR BOOK 1992) سے لئے گئے ہیں۔ قوسین میں فی صد شرح خواندگی دی گئی ہے۔

(۱) افغانستان (۱۲ فیصد) (۲) اردن (۷۰ فیصد) (۳) الجزائر (۵۲ فیصد)
(۴) البانیہ (۷۵ فیصد) (۵) انڈونیشیا (۸۵ فیصد) (۶) ایران (۴۸ فیصد)
(۷) بحرین (۴۰ فیصد) (۸) برونی دارالسلام (۹۵ فیصد) (۹) بنگلہ دیش (۲۹ فیصد)
(۱۰) پاکستان (۲۶ فیصد) (۱۱) ترکی (۷۰ فیصد) (۱۲) تیونس (۴۶ فیصد)
(۱۳) تنزانیہ (۸۵ فیصد) (۱۴) جیبوتی (۲۰ فیصد) (۱۵) چاڈ (۱۷ فیصد)
(۱۶) سعودی (۵۰ فیصد مرد) (۱۷) سوڈان (۳۰ فیصد) (۱۸) سینگال (۱۰ فیصد)
(۱۹) شام (۷۸ فیصد مرد) (۲۰) صومالیہ (۴۰ فیصد) (۲۱) عراق (۷۰ فیصد)
(۲۲) عمان (۲۰ فیصد) (۲۳) قطر (۶۰ فیصد) (۲۴) کویت (۷۱ فیصد)
(۲۵) گنی (۳۵ فیصد) (۲۶) گیمبیا (۱۲ فیصد) (۲۷) لبنان (۷۵ فیصد)
(۲۸) لیبیا (۶۰ فیصد) (۲۹) متحدہ عرب امارات (۶۸ فیصد) (۳۰) مالدیپ (۳۶ فیصد)

(۳۱) مالی (۱۰ فیصد) (۳۲) مراکش (۳۵ فیصد) (۳۳) مصر (۴۴ فیصد)
(۳۴) ملیشیا (۸۰ فیصد) (۳۵) موریطانیہ (۱۷ فیصد) (۳۶) نائیجریا (۴۲ فیصد)
(۳۷) نائیجر (۱۳ فیصد) (۳۸) جنوبی یمن (۲۵ فیصد) (۳۹) یمن عرب جمہوریہ (۲۵ فیصد)

دنیا کے ۳۹ اسلامی ملکوں میں سے ۲۴ ملکوں میں خواندگی کی شرح فی صد ۳۰ سے ۵۰ فیصد ہے۔ بقیہ دس ملکوں میں شرح خواندگی ۵۱ سے ۷۵ فیصد ہے صرف پانچ اسلامی ملکوں میں خواندگی کی شرح ۷۵ سے ۹۵ فیصد ہے۔ ابھی دنیا میں ایک بھی اسلامی ملک ایسا نہیں ہے جہاں کے تمام لوگ خواندہ ہوں۔ ناخواندہ افراد کی سب سے زیادہ تعداد افغانستان، بنگلہ دیش، پاکستان، جیبوتی، چاڈ، سوڈان، سینیگال، عمان، گیمبیا، مالی، موریطانیہ، نائیجر، جنوبی یمن اور یمن عرب جمہوریہ میں ہے۔

کیا یہ لائق صد افسوس بات نہیں کہ جس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم کا حاصل کرنا فرض قرار دیا ہو۔ آج اسی کے نام لیوا اور ماننے والے دنیا میں تعلیمی لحاظ سے اتنے پسماندہ۔ (مجلہ ماہنامہ الاصلاح بمبئی اگست ۱۹۹۳ء)

محترم عبید اللہ فہد صاحب فلاحی کی دو نئی کتابیں منظر عام پر

(۱) "فولادی مومن" اس کتاب کے اندر سید قطب شہیدؒ کی حیات و خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اصلاً یہ کتاب چند مقالات کا مجموعہ ہے جس میں بعض مقالات محترم ڈاکٹر صلاح الدین صاحب عمری کا تحریر کردہ ہے۔ یہ کتاب "ہندوستان پبلیکیشنز ۳۴۵ ممتاز بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ نئی دہلی ۶ سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت: ۴۰ روپئے ہے۔

(۲) "احیائے اسلام نئے محاذ نئے مسائل" اس کے اندر احیائے اسلام کی کوششوں اور اس سلسلے میں درپیش مسائل کے تذکرے ہیں چنانچہ اس کا مطالعہ ہر داعی کی بنیادی ضرورت ہے۔

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل ونہار

فورم فار ڈیموکریسی اینڈ کمیونل امیٹی کے جوائنٹ کنوینر جناب مولانا محمد شفیع مونس صاحب جامعۃ الفلاح میں

فورم فار ڈیموکریسی اینڈ کمیونل امیٹی FORUM FOR DEMOCRACY AND COMMUNAL AMITY (فورم برائے جمہوریت اور فرقہ وارانہ میل ملاپ) کے جوائنٹ کنوینر اور معزز جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر جناب مولانا محمد شفیع مونس صاحب اپنے رفقاء مولانا محمد جعفر صاحب، مولانا محمد اشفاق صاحب، مولانا رفیق احمد قاسمی صاحب اور مولانا ظہیر عالم فلاحی صاحب کے ہمراہ ۶ راگست ۱۹۹۳ء کو جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔ جناب مولانا محمد شفیع صاحب۔ فورم فار ڈیموکریسی اینڈ کمیونل امیٹی کی توسیع کے لئے لکھنؤ تشریف لائے تھے اور اسی سلسلہ میں کلکتہ جاتے ہوئے درمیان میں جامعۃ الفلاح کو رونق بخشی۔

موصوف نے اپنے خطاب میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور فسطائیت کو ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا اور فرمایا انسانیت اس کا نام ہے کہ آپ جو کچھ سوچیں سارے انسانوں کی بھلائی کیلئے سوچیں۔ اور اگر آپ کبھی کسی فرقہ یا گروہ کے مفاد میں سوچیں تو لازماً اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ کسی گروہ یا فرقہ کو نقصان نہ پہنچے۔ اپنے مفاد کے پیچھے اس طرح اندھا ہوجانا کہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے لگے فرقہ پرستی ہے۔ فرقہ پرستی جیسا آگے بڑھتی ہے اور لاٹھی ڈنڈا کے زور پر اپنی بات تسلیم کرائی جاتی ہے تو یہی چیز فسطائیت بن جاتی ہے۔ آج یہ فسطائیت شمشیر برہنہ ہو کر ہمارے ملی وجود کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ اور اس سے ملک کی سالمیت بھی خطرہ میں پڑ چکی ہے۔ ہنگامی طور پر کسی واقعہ کا پیش آجانا اور بات ہے لیکن جب یہ سب کچھ باقاعدہ تحریک بناکر ہو تو معاملہ کی سنگینی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے

اس صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فورم فار ڈیموکریسی اینڈ کمیونل امیٹی کا قیام عمل میں آیا ہے تاکہ ملک کے معتدل مزاج اور سنجیدہ افراد کے ضمیر کو آواز دی جائے۔ مولانا نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ فورم میں شامل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام بند کر دیا بلکہ اس راہ میں حائل ایک بھاری پتھر کو ہٹانے کی یہ ایک کوشش ہے۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں فرمایا کہ جھوٹ کا جواب جھوٹ سے، چوری کا جواب چوری سے اور ڈکیتی کا جواب ڈکیتی سے نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح فرقہ پرستی کا جواب فرقہ پرستی سے مناسب نہیں۔

مولانا محمد شفیع مونس صاحب نے تعلیم وتربیت کی جانب طلبہ کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا۔ طالب علم کی اصل توجہ اپنے مقصد پر ہونی چاہئے، تعلیم وتربیت کا انحصار نہ تو صرف اساتذہ پر ہے اور نہ صرف درسی کتابوں پر بلکہ ان سب کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آپ پوری طرح استفادہ کے لئے تیار ہوں اور ہمیشہ یہ دیکھتے رہیں کہ آپ کی سیرت کو کیا چیز بنانے والی ہے، نظم وضبط کا اہتمام اگرچہ نفس پر گراں ہو، ایک انسان کی تعمیر میں ایک موثر عامل ہے۔ اگر اس دور میں نظم وضبط کی آپ نے پابندی کی تو آئندہ جبکہ آپ کے سر ذمہ داریاں آئیں گی، آپ سے زیادہ اچھی توقعات ہونگی۔ آپ نے فرمایا ہر وہ چیز جو تخریب کاری اور توڑ پھوڑ کے قبیل کی ہے، اس سے ہمارے نوجوان ہمیشہ بچتے رہے ہیں اور یہ انکا امتیاز رہا ہے۔ ان چیزوں سے بچنا اور دوسروں کو بچانا سماج، ملت اسلامیہ اور اس ملک کی ایک بڑی خدمت ہے۔ کچھ اسی طرح کی باتیں مولانا نے کلیۃ البنات میں بھی آکر۔ لڑکی طالبات سے کہیں اور فرمایا آپ اس طرح اپنی تربیت کریں کہ افکار وخیالات، اخلاق وکردار اور عبادات سب کچھ اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ نیز جو چیزیں اسلام سے متصادم ہوں وہ آپ کے قلب ومزاج کو گوارہ نہ ہوں۔

اساتذہ سے گفتگو کے دوران مولانا نے کہا تعلیم وتربیت کے اصل ذمہ دار اساتذہ ہیں، وہ اگر طے کرلیں کہ انہیں تعلیم دینی ہے، اصلاح کرنی ہے، بچوں کو بنانا ہے تو پھر کوئی

رکاوٹ حائل نہیں ہوسکتی، اساتذہ کا عزم وسائل کی کمی، نصاب کی خرابی اور ہر دوسری خامی کی تلافی کرسکتا ہے۔

اس موقع پر ممنوعہ جماعت اسلامی کے قیم جناب محمد جعفر صاحب نے جمعہ کے خطبہ میں صحیح معنوں میں مومن بنتے، اسلام پر عمل کرنے، حق کی گواہی دینے اور اتحاد وتنظیم کی دعوت دیتے ہوئے حاضرین کو مشورہ دیا کہ حالات سے دل شکستہ اور مایوس ہونا مرد مومن کے شایان شان نہیں۔

طالبات کیلئے دارالاقامہ کی تعمیر

طالبات کی کثرت اور روز افزوں اضافہ کی وجہ سے ان کے قیام کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہوچکا تھا۔ چھوٹی سی جگہ میں کثیر تعداد میں طالبات کا قیام انکی تعلیم وتربیت پر اثر انداز ہو رہا تھا خدا کا شکر ہے کہ اب یہ مسئلہ نہایت عمدگی کے ساتھ حل ہوتے جا رہا ہے۔ جامعہ کی سات ایکڑ خریدی ہوئی زمین میں طالبات کی درسگاہ کیلئے ایک بلڈنگ تیار ہوکر اسی سال سے زیر استعمال ہے اور اب اسی زمین کے باقی ماندہ حصہ میں ایک وسیع وعریض اور شاندار بلڈنگ ایک ہزار طالبات کے قیام کیلئے بنتے جا رہی ہے، جس کا موقع محل دیکھا جا چکا ہے، اور پیمائش کا کام بھی ہو چکا ہے اس شمارہ کے آپ کے ہاتھوں میں پہونچنے تک، امید ہے تعمیراتی کام شروع ہو چکا ہوگا۔ اس بلڈنگ میں قیام کی سہولت کے علاوہ ایک ڈائننگ ہال، ایک لائبریری اور ایک مسجد کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے، یہ تمام تعمیرات مکمل ہونے کے بعد بیچ میں ایک وسیع وعریض میدان بھی ہوگا جو طالبات کے لئے مختلف طرح کی سہولتیں فراہم کرے گا۔ ہم آئندہ شماروں میں بھی اس تعمیر کی رفتار کے بارے میں مطلع کرتے رہیں گے۔ انشاء اللہ بہت جلد ہمارے ان بہی خواہوں کی شکایتیں رفع ہو جائیں گی جنکی بچیوں کا داخلہ جگہ کی قلت کی بنا پر روک دیا جاتا تھا اور یہ شکایت بھی دور ہوسکے گی کہ لڑکیوں کی صحت پر جگہ کی تنگی کی وجہ سے برا اثر پڑ رہا ہے۔

یوم آزادی کے موقع پر جامعہ میں پروگرام

پندرہ اگست ۹۳ء کو حسب معمول تعلیم بند

ششماہی امتحان کے قریب ہونے کی وجہ سے پروگرام مختصر رہا۔ صدر جامعہ مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی نے اس موقع پر فرمایا یہاں سے باہر کی قوم چلی گئی اور یہاں کے باشندوں کو خود اپنا انتظام چلانے کا موقع ملا اسی معنی میں یہ ملک آزاد ہوا۔ آزادی کے بعد جو دستور بنا اس میں تمام شہریوں کو برابر کے حقوق ملے اور حکومت کو مذہب کے لحاظ سے غیر جانبدار بنایا گیا۔ یہ دستور ہندوستان جیسے ملک کیلئے مناسب تھا لیکن عمل کے اعتبار سے دھیرے دھیرے فرق آتا گیا۔ پہلے افراد اور پارٹیوں کے اندر جانبداری آئی اور اب صورتحال یہ ہے کہ خود حکومت بھی جانبدار بن گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت ہے جس میں حکومت اور اس کے سب سے بڑے ذمہ دار پی وی نرسمہا راؤ وزیر اعظم ہند شامل ہیں۔ جب حکومت خود دستور کی دھجیاں بکھیرے، اقلیتوں کو تحفظ دینے کے بجائے انہیں ختم کرنے کے درپے ہو تو ضرورت ہے کہ سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ اب کیا لائحہ عمل اور طریقہ کار مناسب ہے۔

مولانا عبدالکریم انور حکیمی صاحب نے آزادی کی حقیقت اور اس سلسلہ کی بعض غلط فہمیاں رفع کرنے کی کوشش کی اور فرمایا جب تک کہ اپنی اجتماعی ضروریات وخواہشات پوری کرنے پر انسان قادر نہ ہو صرف غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہونے کا نام آزادی رکھنا غلط فہمی ہے، مولانا جلال الدین مفتاحی صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا ملکی تحفظ اور بقا کیلئے اصول وضوابط کی پابندی لازمی ہے، اس کی خلاف ورزی کرنے پر ملک پارہ پارہ ہو سکتا ہے۔

اس موقع پر طلبہ جامعہ نے بھی اپنے خیالات پیش کئے۔ قاسم رسول متعلم عربی ششم نے کہا مغل حکمرانوں نے اس ملک کو سونے کی چڑیا بنایا، عدل وانصاف کے نادر نمونے قائم کئے۔ یہ تاج محل، لال قلعہ، قطب مینار، جامع مسجد دہلی اسی دور کی یادگار ہیں، انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے جہادِ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک قدم قدم پر آزادی کے لئے مسلمانوں کی قربانیوں کے روشن نشانات

ملیں گے۔ اشفاق اللہ خانؒ کاکوروی، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان جیسے دوسرے مجاہدین آزادی کی قربانیوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ سلطان ٹیپو کا یہ جملہ آج بھی جوانوں کو حوصلہ دیتا ہے "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے" لیکن حیرت ہے اس کے باوجود آج اس طرح کے نعرے لگ رہے ہیں "ہندی، ہندو، ہندوستان مسلم جا کے پاکستان" یا "مسلمانوں کے دو استھان، قبرستان یا پاکستان" یا ہندوستان میں رہنا ہے تو وندے ماترم کہنا ہے۔

محمد الیاس اکولوی عربی پنجم نے اپنی تقریر کے دوران بتایا کہ آزادی کی تحریک چل رہی تھی، ایک طرف کانگریس تھی، دوسری جانب مسلم لیگ، دونوں قومیت کی علمبردار تھیں اور دونوں میں چوٹی کے اکابر شامل تھے لیکن سب قومیت کے دھارے میں بہے جارہے تھے ان حالات میں ایک وہ بھی شخص تھا جس کی نگاہ دستہ کے تمام پیچ وخم پر تھی اور جس کی انگلیاں وقت کی نبض پر تھیں۔ اس نے بتایا ہاتھوں کی تبدیلی اصل چیز نہیں اصل چیز یہ ہے کہ انسان کے مزاج اور فکر کی اصلاح ہو، انسان اندر سے بدلے اور اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرے، اس کا کہنا تھا یہ زمین اللہ کی ہے، ہماری تمہاری یا کسی اور کی نہیں، اس پر اللہ کا حکم چلنا چاہئے، اس نباضِ وقت کو دنیا مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آج بھی ضرورت ہے کہ ہم اس کام کو لیکر اٹھیں اور بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی اور غلامی میں لے آئیں۔

اس موقع پر جو طلبہ مختلف پروگراموں کے لئے اسٹیج پر آئے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ مشتاق الاسلام حفظ، محمد شاکر الاکرم، طارق وانی، رضوان خان گیا، عظیم الدین ہشتم ثانوی ب، مصباح الاسلام ہشتم ثانوی، اطہر علی ہشتم ثانوی، وسیم اکرم شعبہ حفظ، انیس احمد ورجیہ ہفتم ثانوی۔

ششماہی امتحان جاری

ششماہی امتحان جاری ہے یہ شمارہ جب آپ کے ہاتھوں

میں پہنچے گا، امتحان ششماہی ۹۴-۱۹۹۳ء ختم ہو چکا ہوگا اور طلبہ اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے ہوں گے۔ ۲۹ ربیع الاول مطابق ۱۸ ستمبر ۱۹۹۳ء سنیچر سے دوبارہ جامعہ کھل جائیگا۔

جامعہ سے مولانا مشتاق احمد فلاحی صاحب، ماسٹر ابو صالح صاحب، ماسٹر محمد ہارون صاحب مختلف ملحقہ مدارس میں امتحانات کی نگرانی کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔

لمحۂ فکریہ

قمر رام نگری۔

دل میں ترے اللہ کا ڈر ہے کہ نہیں ہے
ناداں! تجھے کچھ اسکی خبر ہے کہ نہیں ہے

ہے تجھ کو مٹا دینے کی جو سازش پیہم
غافل! تری کچھ اس پہ نظر ہے کہ نہیں ہے

ہے آن پڑا تیرا سفینہ جو بھنور میں
سوچ اسکی کوئی راہ مفر ہے کہ نہیں ہے

جس راہ پہ چلتا ہے تو کچھ سوچا ہے تو نے
وہ ہادیِ اعظمؐ کی ڈگر ہے کہ نہیں ہے

ہے ساری تگ و دو تری بس ختم یہیں تک
عقبیٰ کی بھی کچھ فکر مگر ہے کہ نہیں ہے

پہنچے ہے تجھے ملکِ عدم جانا ہے اک دن
کچھ پاس ترے زادِ سفر ہے کہ نہیں ہے

جو پھونک کے رکھ دیتی تھی ہر خرمنِ باطل
اب راکھ میں تیری وہ شرر ہے کہ نہیں ہے

کانپ اٹھتے تھے کل جس سے پہاڑوں کے جگر بھی
نعروں میں ترے اب وہ اثر ہے کہ نہیں ہے

بکھرا ہے جو شیرازہ ترا اس کی خبر ہے
تو اسکے سبب زیر و زبر ہے کہ نہیں ہے

ہیں قربِ قیامت کی حدیثوں میں جو خبریں
منظر وہی اب پیشِ نظر ہے کہ نہیں ہے

گذری ہے تری زندگی جو لہو و لعب میں
افسوس کا تجھے اس پہ مگر ہے کہ نہیں ہے

انجمن طلبہ قدیم

ایک تعارف

پتہ رابطے کا

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح بلریا گنج
اعظم گڑھ یوپی پن کوڈ ۲۷۶۱۲۱
فون نمبر ۲۸۱۸۰ - کوڈ نمبر ۰۵۴۶۲

جامعۃ الفلاح جن اعلیٰ و ارفع اغراض و مقاصد کے حصول کیلئے قائم کیا گیا وہ اب محتاج تعارف نہیں رہا، انہی اغراض کو منظم طور پر حاصل کرنے کیلئے یہاں کے فارغین کی ایک انجمن "انجمن طلبۂ قدیم" کے نام سے ۱۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو قائم کی گئی۔ تاکہ انکی آواز میں وزن اور اعتماد پیدا ہوسکے اور اعلیٰ پیمانے پر وہ یہ فریضہ انجام دے سکیں۔ آغاز کار ہی میں جناب مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی مرحوم کے زیر نگرانی اس کا دستور مرتب کیا گیا تھا اور برابر یہ قافلہ انکی رہنمائی میں جانبِ منزل رواں دواں رہا، اس انجمن نے شروع ہی سے اپنے اغراض و مقاصد واضح طور پر متعین کر لیے تھے جو درج ذیل ہیں۔

اغراض و مقاصد

(۱) فارغین جامعہ کو مقاصد جامعہ کے حصول کیلئے منظم کرنا۔

(۲) انکی صلاحیتوں کو ان مقاصد کیلئے زیادہ سے زیادہ مفید اور موثر بنانے کی تدابیر اختیار کرنا۔

(۳) جامعہ کی تعمیر و ترقی میں ذمہ داران جامعہ کے ساتھ تعاون کرنا۔

(۳) متعلقہ جامعہ کے حصول کیلئے دیگر دینی وتعلیمی اداروں سے ربط رکھنا اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

طریقہ کار یہ بھی طے کر لیا تھا کہ مندرجہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے حسب ذیل طریقے اختیار کئے جائیں گے۔

(الف) تمام فارغین سے ربط رکھنا، انکے مسائل سے آگاہی حاصل کرنا اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرنا۔

(ب) وقتاً فوقتاً فارغین جامعہ کا عام اجلاس منعقد کرنا۔

(ج) مقاصد انجمن کے حصول کے لئے نشر و اشاعت کے مختلف ذرائع اختیار کرنا۔

اس روشنی میں الحمدللہ انجمن اپنے قیام کے بعد ہی سے مسلسل ان مقاصد کے حصول کیلئے کوشاں ہے جہاں جہاں طلبہ قدیم معتدبہ تعداد میں ہیں وہاں اسکی یونٹیں بھی قائم ہیں جو منظم انداز میں ان مقاصد کے حصول کیلئے اپنے اپنے مقامات پر کوشاں رہتے ہیں۔

اب تک اپنی بے بضاعتی کے باوجود انجمن جو کچھ کرنے میں کامیاب ہو سکی ہے، اسکی ایک جھلک یوں ہے۔

"حیات نو" کا اجراء جس کا مقصود یہ ہے کہ مقاصد جامعہ کا تعارف کرایا جائے، طلبۂ قدیم کی علمی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جائے طلبہ قدیم اور طلبہ کو تعلیمی رہنمائی فراہم کی جائے۔ طلبہ قدیم اور طلبہ کے سرپرستوں سے رابطہ کا ذریعہ بن سکے اور دینی مدارس کے مابین توافق و تعاون پیدا کرنے میں معاون ہو سکے۔

الحمدللہ کسی نہ کسی درجے میں ہمیں یہ فوائد حاصل ہو رہے ہیں اور تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے ہم برابر اسے جاری بھی رکھے ہوئے ہیں اور خسارے کے باوجود تقریباً دو سو مدارس کو اعزازی طور پر روانہ کر رہے ہیں۔

وظائف طلبہ قدیم کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے مستقل وظائف دیئے جاتے ہیں، اس وقت بھی کئی طلبہ کو یہ وظائف فراہم کئے جا رہے ہیں، اسی طرح وقتی ضرورتوں کیلئے بھی مختلف قسم کا تعاون انہیں فراہم کیا جاتا ہے۔

جامعہ کی تعمیر و ترقی ذمہ داران جامعہ کو مسلسل عملی تعاون دیا جاتا ہے، اب تک درج ذیل پہلوؤں سے یہ تعاون فراہم کیا گیا ہے۔

(الف) جامعہ کا ماسٹر پلاننگ تیار کرایا گیا اور اسکی تکمیل کیلئے وسائل کے حصول کی کوشش کی گئی، کئی اہم منصوبے انجمن کی کوششوں سے عملی جامہ پہن چکے ہیں اور کئی منصوبے زیر تکمیل ہیں۔

(ب) طالبات کی لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا۔

(ج) جامعہ، طلبہ، طالبات کی لائبریریوں کیلئے کتابیں اور الماریاں فراہم کی گئیں۔

(د) ہر سال تعلیم میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات دیئے جاتے ہیں۔

(ہ) طلبہ کی علمی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے انکے مقابلے کرائے جاتے ہیں

(و) مطبخ میں طلبہ کے بیٹھنے کیلئے میزوں اور بنچوں کا نظم کیا گیا۔

(ز) طلبہ کیلئے کیمپس میں کینٹین قائم کی گئی۔

(ح) طلبۂ جامعہ کو تعلیمی وظائف دیئے جاتے ہیں اور انکی فوری ضروریات کی بھی تکمیل کیجاتی ہے

(ط) طالبات کی آمد و رفت کی پریشانیاں حل کرنے کیلئے انجمن نے ایک بس اپنی کوششوں سے فراہم کی۔

(ی) مختلف یونیورسٹیوں سے جامعہ کا الحاق کرانے کی سعی کی گئی، نیز اس سلسلے میں مزید کوششیں جاری ہیں۔

سمینار فروری ۱۹۹۱ء میں کونشن کے موقع پر ایک سمینار بعنوان "دینی مدارس کے مسائل اور انکا حل" منعقد کیا گیا تھا۔ الحمدللہ اسمیں بیش قیمت مقالے پیش کئے گئے تھے جسے ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح کی جانب سے کتابی شکل میں طبع کرایا گیا اور تقریباً سو اداروں اور دینی مدارس کو بغرض استفادہ ھدیۃً انجمن کی جانب سے روانہ کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں کونشن کے موقع پر ایک دوسرا سمینار بعنوان "ملک و ملت کی تعمیر اور دینی مدارس" منعقد کیا گیا جسمیں اہم نمائندہ دینی مدارس کے ذمہ داران اور دانشوران شریک ہوئے، اسمیں پیش کردہ مقالات کا مجموعہ بھی اس وقت زیر اشاعت ہے۔

منصوبے آئندہ فوری توجہ کے

بھی انجمن کے پیش نظر ہیں۔

- مستقل آفس کا قیام تاکہ ربط و ضبط کے مسائل کا موثر حل ہو سکے۔
- طلبہ قدیم کی علمی کاوشوں کی اشاعت۔
- ٹیکنیکل ٹریننگ کا نظم۔
- حاجت مند اور نادار طلبہ کی ضروریات کی تکمیل کیلئے ایک مستقل فنڈ جو صندوق البر کے نام سے قائم کیا گیا ہے، اسکو مستحکم کرنا۔
- کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح کی لائبریری کے لئے ایک لاکھ روپے کی کتابوں کی فراہمی — تاکہ وہ انکی ضروریات کو پورا کرنے کے لائق ہو سکے۔ واضح رہے کہ وہ قائم بھی طلبہ قدیم کی کوششوں ہی سے ہوئی۔
- مولانا جلیل احسن ندوی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا نظم۔
- المجدبوائز ہاؤس کا قیام۔
- مدارس عربیہ کے طلبہ کے درمیان علمی و ثقافتی تبادلہ۔
- قرب و جوار کے عوام و خواص سے دعوتی و تحریکی ربط رکھنے کیلئے مواصلات کی فراہمی اس سلسلے میں فوری طور پر ایک جیپ کی خریداری۔

تاثرات

"انجمن طلبہ قدیم ایک متحرک اور باعزم تنظیم ہے ...... مجھے یہ اندازہ کر کے خاصا اطمینان ہو رہا ہے کہ افق پر کرنیں ابھرتی جا رہی ہیں۔ خدا کرے یہ کرنیں بلند سے بلند تر اور روشن سے روشن تر ہوتی جائیں۔"

(مولانا صدر الدین اصلاحی)

"میری معلومات کی حد تک آپ کی انجمن طلبہ قدیم شاید واحد انجمن ہے جو مستقل پروگرام رکھتی ہے، مادر علمی سے قلبی تعلق رکھتی ہے، وہاں کے ذمہ داروں کے خلاف محاذ بنانے کے بجائے تعاون کرتی ہے۔ اپنے بیش رو چھوٹے ساتھیوں کی خبر گیری کرتی اور عملی تعاون کرتی ہے۔ یہ میرے ہی نہیں ہر اس شخص کیلئے جو جامعہ سے قلبی لگاؤ رکھتا ہے انتہائی خوشی کی بات ہے آپ کی انجمن ایک فعال، متحرک اور سرگرم انجمن ہے۔"

(مولانا شہباز اصلاحی)

استاد دار العلوم ندوۃ العلماء

روداد انجمن

محمد اسمٰعیل فلاحی

۲۵ اگست [illegible] فلاحی برادران کی ایک نشست زیر صدارت سکریٹری انجمن [illegible] عمران فلاحی صاحب ہوئی۔ مولانا جمیل احمد فلاحی صاحب نے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" (یقیناً فلاح پا گیا وہ [illegible] نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا) کی [illegible] کی اور بتایا اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت میں خیر و شر کا شعور [illegible] ہے اور ہماری فطرت فطرتِ سلیم بنائی ہے۔ ہماری کامیابی اس میں [illegible] نفس کے ہاتھ میں اپنی لگام نہ دیں۔ ہمیشہ اس بات پر نگاہ رکھیں کہ [illegible] سے آلودہ نہ ہو اور نیکی کے رجحانات کو ابھارنے اور بدی کے [illegible] پانے کی کوشش کریں۔

طے پایا کہ طلبہ کے سرپرستوں کو "حیات نو" کے لئے خطوط لکھے جائیں اور فلاحیات کی طرف بھی توجہ کی جائے ان کی نگارشات حاصل کی جائیں اور انہیں خریدار بنایا جائے۔

جیپ کی خریداری کیلئے ابھی تک مطلوبہ رقم فراہم نہیں ہو سکی ہے۔ اسلئے دہلی اور بعض جگہوں پر اس سلسلے میں وفود بھیجے جائیں گے۔

نیز یہ بات بھی سامنے آئی کہ قرب و جوار کی بستیوں میں اصلاح معاشرہ کی کوشش کیجائے۔ مسلمانوں کے باہمی تنازعات ختم کرنے اور انہیں اسلامی زندگی گذارنے پر ابھارا جائے اس طرح سماج سدھار کیساتھ ساتھ طلبہ [illegible] کے اندر بیداری آئیگی۔ جامعہ سے انکا ربط مضبوط اور گہرا ہوگا اور جامعہ اپنے مقصد [illegible] بیش رفت کر سکے گا اس سلسلہ کا تفصیلی پروگرام ان شاء اللہ [illegible] کر دیا جائیگا۔